علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم

طلوعِ اسلام

ایک مکمل اسلامی مجلہ

اگست ۱۹۳۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

مرتب

محمد یونس

بدل اشتراک

سالانہ	دس روپے
ششماہی	چھ روپے
قیمت فی پرچہ	ایک روپیہ

جلد ا — نمبر ۸

فہرست

نذر عقیدت
لمعات ۲
سلیم کے نام ...
جناب پرویز ۹
جشن آزادی ۲۷
عزیم حرم
جناب اسد ملتانی ۲۸
مصرع ثانی ۲۹
محشرستان پنجاب کا پس منظر
(لیگ کا ایک پرانا کارکن) ۲۳
۱۵ اگست ۶۲
قوم پوچھتی ہے ۷۰
پاکستان میں پہلا رمضان المبارک ۷۹

نذرِ عقیدت

بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۳۰ء تک مسلمانانِ ہند کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انھیں اِدھر سے اُدھر اڑا لے جاتا۔ پانی کی رو آتی اور انھیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ قوم نہیں ایک ناقہ تھی بے زمام، ایک کارواں تھا بے منزل و بے سالار۔ ان کی سعی و عمل، بگولے کے رقص اور سمندر کی لہروں سے زیادہ نتیجہ خیز نہ تھی کہ اس محشرستان تشتت و انتشار میں اللہ کا ایک بندہ اٹھا جسے مبدءِ فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کے ساتھ "دانشِ نورانی" کی متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز کیا تھا۔ اس نے قافلہ کے منتشر افراد کو للکارا اور کہا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ قرآن نے تمہاری منزل کونسی متعین کی ہے اور ہندوستان کے احوال وظروف کے پیشِ نظر اس منزل تک پہنچنے کے لئے کونسی راہ سیدھی ہے۔ اس نے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کیا اور الہ آباد کے مقام پر کھلے اور واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

> شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام اس علاقہ کے
> مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے (خطبۂ صدارت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ)

پھر اس کی نگۂ دوررس ایک ایسے صاحبِ فراست و اخلاص کی متلاشی رہی جو ملتِ اسلامیہ کی اس متاعِ بردہ کی بازیافت کے لئے مقدمہ لڑے اور قوم کو راہ میں فروخت ہی نہ کر دے۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں اس نے یہ دستاویز ایک ایسے آزمودہ کار، صاحبِ دیانت و اخلاص، وکیل کے ہاتھوں میں دیدی جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ دنیا نے اسے محمد علی جناح، اور ملت نے قائدِ اعظم کہہ کر پکارا۔

اس نحیف و ناتواں رہبرِ فرزانہ نے جس تدبر و فراست اور اخلاص و دیانت سے اس مقدمہ کو لڑا، دنیا کی عدالتیں اس پر متعجب و حیراں ہیں۔ اللہ نے اس کے حسنِ نیت کو متاعِ کامرانی سے نوازا اور اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں وہ قوم کے حق میں ڈگری لے کر احاطۂ عدالت سے باہر آیا۔

ملتِ اسلامیہ، اُس مفکرِ اعظمؒ اور اِس قائدِ اعظم کی بارگاہِ عالیہ میں، حسنِ عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے کا فخر حاصل کرتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کراچی کی ایک نجی تقریب میں، وزیر امورِ داخلہ، محترم خواجہ شہاب الدین صاحب نے فرمایا کہ

> غیر سرکاری اداروں کو چاہئے کہ وہ تعمیرِ ملت کے امور میں حکومت سے تعاون کے لئے آگے بڑھیں۔

اور مشرقی بنگال کے وزیرِ اعظم، محترم خواجہ ناظم الدین صاحب نے فرمایا کہ

> پاکستان کے اربابِ فہم و تدبر کو چاہئے کہ وہ ملک کی فلاح و فوز کے لئے ٹھوس تجاویز لیکر آگے بڑھیں۔ حکومت یقیناً تمام ٹھوس تعمیری تجاویز کا خیر مقدم کریگی۔ (ڈان ۲۴ جولائی ۴۸ء)

ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے اربابِ وزارت میں ایسے صاحبانِ بصیرت بھی ہیں جنھوں نے حکومت اور ملت میں رابطہ کی ضرورت محسوس کی ہے اور ملت کے ذی فہم طبقہ کو دعوت دی ہے کہ وہ تعمیرِ ملت کے مقدس فریضہ کے سرانجام دہی میں حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔ لیکن ہم اپنے ان خواجگانِ کرام سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے کبھی اس پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارا فرمائی ہے کہ ملت اور حکومت کے درمیان اس فقدانِ رابطہ کی وجہ کیا ہے اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر جراءت بیباکی معاف ہو تو ہم عرض کریں کہ ہمارے اربابِ حکومت عرش کی ان بلندیوں پر رہتے ہیں جہاں سے زمین کے رہنے والے غریبوں کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ و تعلق پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اوروں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ اپنا تجربہ عرض کرتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کے گذشتہ سات پرچے اٹھا کر دیکھئے۔ اس کی کوئی اشاعت ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی تعمیری تجویز نہ پیش کی گئی ہو یا جس میں یہ نہ بتایا گیا ہو کہ ملت اور حکومت کے درمیان جو مغائرت اور بیگانگی کی جو خلیج پیدا ہو رہی ہے اسے جلد از جلد پاٹنے کی ضرورت ہے۔ طلوعِ اسلام نے ان چیزوں کو شائع کر دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کا بھی التزام کیا کہ ہر پرچہ کی کاپی ایک نجی مکتوب کے ساتھ، وزیرِ متعلقہ کی خدمت میں بھیجی جائے جس میں ان کی خصوصی توجہ امرِ زیرِ بحث کی طرف مبذول کرائی جائے۔ اس اہتمام و التزام کے باوجود (بجز دو ایک فرعی امور کے) کسی صاحب میں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ رسالہ یا خط کی رسید کے عام اخلاقی تقاضا ہی کو پورا کر دے۔ ہم محترم خواجہ شہاب الدین صاحب سے بالخصوص دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس ذلت آمیز سلوک کے بعد وہ ملت کے غیور و ذی ہوش طبقہ سے

کس طرح توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ حکومت کے ساتھ روابط و تعاون کا ہاتھ بڑھائے ؟ طلوعِ اسلام نے اپنے متعلق خود آپ کبھی نہیں کہا۔ لیکن بعض مواقع ایسے آجاتے ہیں کہ اس باب میں بھی لب کشائی کرنا ہی پڑتی ہے۔ حصولِ پاکستان کی جدوجہد کے زمانہ میں، طلوعِ اسلام کو ہمیشہ ملت کا صحیح ترجمان سمجھا جاتا رہا۔ ہمارے بڑے بڑے راہنمایانِ قوم اس کی راہ تکا کرتے تھے اور اپنے دعاوی کی تائید میں اس کے حوالے بطور سند پیش کیا کرتے تھے۔ اس وقت ہمارے اکابرین، اپنے اور اپنی قوم کے درمیان ربط و نظم کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ان کی عزت و توقیر کا راز ہی اس رابطہ و یگانگت میں تھا۔ لیکن حصولِ حکومت کے بعد، ان کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ وہ اپنے آپ کو قوم سے بالکل الگ تھلگ سمجھ بیٹھے ہیں، اور اتنا معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے کہ قوم کیا چاہتی ہے اور کیا کہتی ہے۔ طلوعِ اسلام کو اس بارگاہِ صمدیت کی سنگِ آستاں کی جبہ سائی نے ایسا "دماغِ سکندری" عطا فرمایا ہے کہ وہ کسی سے "نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید" رکھتا ہے اس لئے نہ جلبِ منفعت کی جاذبیتیں کبھی اس کا دامن روک سکی ہیں، اور نہ دفعِ مضرت کے اندیشے اس کے گلوگیر ہو سکے ہیں۔ لہٰذا طلوعِ اسلام جو کچھ اربابِ اقتدار و حکومت کے گوش گذار کرتا رہا ہے، اس میں اس کا کوئی ذاتی مقصد پوشیدہ نہ تھا، لیکن اس کے باوجود جو سلوک اس کی پیش کردہ تجاویز کے ساتھ روا رکھا گیا وہ یقیناً ایسا نہیں کہ اسے اربابِ اقتدار کی طرف سے "خیر مقدم" پر محمول کیا جائے۔

ہم محترم خواجہ صاحب سے گذارش کریں گے کہ وہ طلوعِ اسلام کے گذشتہ سات پرچوں کی ورق گردانی فرمائیں (یا یہ کام اپنے دفتر میں کسی کے سپرد کر دیں) اور پھر دیکھیں کہ ان میں تعمیرِ ملت کے متعلق کتنی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ اگر وہ اتنی زحمت خود گوارا کرنا پسند نہ فرمائیں تو ہمیں ارشاد فرمائیں ہم ان تمام تجاویز و گذارشات کی فہرست مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ اس کے بعد وہ خود اندازہ فرما لیں کہ تعاون، قوم کی طرف سے نہیں ہو رہا یا اربابِ حکومت ہی اپنے آپ کو اس سے مستغنی سمجھ رہے ہیں۔

ہم نے اس تذکرہ کی ابتدا طلوعِ اسلام کی کوششوں سے اس لئے کی ہے کہ یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے جسے پورے وثوق کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے ورنہ ہمیں معلوم ہے کہ ملک میں کیسے کیسے قابل جوہر ہیں جو زبوں و خوار پھر رہے ہیں، اور حکومت نے آج تک کبھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ان کے ذہنی و قلبی استعداد سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کی خداداد صلاحیتوں سے تعمیرِ ملت کے عظیم القدر فریضہ کے سلسلہ میں متمتع ہوا جائے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے بعض حضرات نے، جو دل میں مفادِ ملت کا درد اور پہلو میں اس کے لئے تڑپ رکھتے تھے از خود اپنی خدمات پیش کیں لیکن ان کی اس پیش کش کو ایک حقارت آمیز خاموشی اور ذلت انگیز بے اعتنائی سے ٹھکرا دیا گیا۔ وہ بھی ہیں جو اس قسم کی بیش بہا تجاویز کو لیکر آئے لیکن انھیں اربابِ اقتدار کے بلند بام محلات کے صبر آزما طوافوں کے باوجود شرفِ باریابی عطا نہ ہو سکا اور وہ اپنی تجاویز کو اپنے ذہنوں میں لئے واپس چلے گئے۔

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں !

ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں !!

اور ایسا بھی سنا گیا ہے کہ اگر کبھی کسی کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی کے ماحصل کو شرف پذیرائی نصیب بھی ہوا ہے تو دنیا نے اس کا نام کہیں نہیں سنا۔ وہ کسی اور کے نام سے منسوب ہوکر منصۂ شہود پر آیا ہے۔ کیا خیر مقدم اور تعاون اسی کو کہتے ہیں! خونِ فرہاد سے عشرت کدۂ پرویز کی گلکاریاں، تعاون نہیں استحصال کہلاتی ہیں۔

اور اگر ہمارے محترم خواجہ صاحب اپنی نگاہ کو پاکستان کے اطراف واکناف تک رخصتِ تلاش و تجسس نہ بھی دینا چاہیں تو کم از کم اپنے کمرے کی کھڑکی سے اپنے گرد و پیش کے دفاتر پر ہی ایک نظر ڈالیں۔ ان دفاتر کے بوسیدہ کاغذات کے نیچے دبے ہوئے ایسے ایسے جوہرِ قابل موجود ہیں کہ بلا مبالغہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو ہمارے بعض بعض وزراء سے کہیں بہتر قلمدانِ وزارت کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ لیکن انگریز اور ہندو کی غلامی میں بھی انہیں اس بری طرح سے نہیں کچلا جاتا تھا جس طرح انہیں اپنی حکومت میں کچلا جا رہا ہے۔ ان میں اکثر وہ ہیں کہ مسلم لیگ کے دورِ جنگِ آزادی میں، جبکہ ہمارے اعاظم ملت کو حکومت کے "حریم قدس" میں جھانکنے تک کی بھی اجازت نہ تھی، یہ "دیوانے" اپنی جانوں پر کھیل کر حقِ رفاقت ادا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے مشوروں کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ ان کا تعاون موجبِ احسانمندی گردانا جاتا تھا، ان کی قدر ہوتی تھی۔ آج ان کے وہی دل و دماغ اور وہی عزائم و مقاصد ہیں۔ لیکن انہیں کوئی پوچھتا تک نہیں۔ انگریز اور ہندو آقا' ان "غلاموں" سے وہ بُعد و مغائرت نہیں رکھتے تھے جو آج رکھی جا رہی ہے۔ جو کل تک ان کے پیچھے پیچھے پھرا کرتے تھے آج ان کا سلام تک قبول نہیں کرتے!

یہ وہی سوختہ ساماں ہیں! تجھے یاد نہیں؟

اگر ان میں سے کہیں خودداری اور عزتِ نفس کی "بو" آجاتی ہے تو اس جرم کی پاداش میں انہیں ذلیل سے ذلیل تر کیا جاتا ہے۔ ان سے اچھوتوں سے بھی بدتر سلوک ہو رہا ہے۔ چند دراہم کا سدھ کے عوض ان کے "جوہرِ ادراک" خرید لئے جاتے ہیں لیکن انہیں "شریکِ حکم" کبھی نہیں کیا جاتا۔ اب انہیں اس قابل ہی نہیں سمجھا جاتا کہ ان کے کسی مشورہ پر غور بھی کیا جائے۔ یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے خوشامد پرستی اور تملق پیشگی اختیار نہیں کی۔ ان کی غیرت نے ان کی بیویوں کو "چراغِ خانہ" کے بجائے "شمعِ بزم" نہیں بننے دیا۔ ان کے ضمیر نے انہیں سرشام کلب کی رنگینیوں میں ڈوب جانے کی اجازت نہیں دی۔ اور ان کے ایمان نے انہیں پارٹی بازی کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں کا حربہ بننے سے روکے رکھا ہے۔ آج یہ ذلیل و خوار ہیں۔ انہیں کوئی پوچھتا تک نہیں۔ حالانکہ کل تک ان کی بے حد قدر و منزلت تھی۔

شریف مکہ رہا ہے کئی برس اے شیخ یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

یہی آپ کا اربابِ فہم و تدبر (Intellectuals) کا طبقہ ہے جسے آپ دعوتِ تعاون دے رہے ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے ان کے تعلیم یافتہ طبقہ کا بیشتر حصہ ملازمتوں میں جذب ہو جاتا ہے۔ بہت تھوڑا ہے جو اس حلقہ سے باہر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ ملازمت پیشہ حضرات کو اس وجہ سے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے کہ وہ آپ کے ماتحت ہیں، اور ان سے باہر کے طبقۂ اہلِ فہم کو اس لئے قابلِ توجہ نہیں سمجھتے کہ ان کے پاس دولت

نہیں ہے۔ تو آپ کو ملت کے اربابِ فہم و تدبر کے تعاون سے دستکش ہو جانا چاہیے۔ ہمارے اربابِ اقتدار کے نزدیک جب تک دولت معیارِ تکریم ہے، انھیں متاعِ عقل و فکر سے تمتع نصیب نہیں ہو سکتا۔ پاکستان میں جب تک اقدار نہیں بدلی جاتیں، جب تک اربابِ بست و کشاد کی نگاہوں کا زاویہ نہیں بدلتا، انھیں ملت کا وہ تعاون حاصل نہیں ہو سکتا جس کی دعوت محترم خواجہ صاحبان دے رہے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ آپ نے باہمی تعاون و تناصر کے لئے کونسی فضا سازگار پیدا کی ہے۔ آپ نے اُن حجب و اسداد کے مٹانے کے لئے کونسا اقدام کیا ہے جو آپ کے اور ملت کے درمیان اس بری طرح سے حائل ہو رہے ہیں، آپ نے بیگانگی اور مغائرت کی اس خلیج کو پاٹنے کے لئے کیا تدابیر سوچی ہیں جو قوم اور اربابِ اقتدار کے درمیان موجود ہے؟ آپ نے عوام کے ساتھ استواریٔ روابط کے لئے کون سے سلیقے سوچے ہیں؟ آپ نے آج تک افرادِ ملت کے جوہروں کو ابھرنے اور نشو و ارتقا حاصل کرنے کے لئے کیا کیا مواقع بہم پہنچائے ہیں؟ آپ نے اہلِ علم و شعور طبقہ کی حوصلہ افزائی کے لئے کیا کیا اسباب و ذرائع مہیا کئے ہیں؟ وہ ہاتھ کہاں ہے جسے حکومت کی طرف سے اہلِ ہنر سے تعاون کے لئے بڑھنا ہے؟ کیا آپ ایک ہی ہاتھ سے تالی بجانا چاہتے ہیں؟ یہ تو نہ کبھی ممکن ہوا ہے نہ ہو گا! ہمارے محترم خواجہ صاحبان نے عوام کے ساتھ جن روابط کی ضرورت کا آج احساس آیا ہے، ہم کامل چھ ماہ سے اس کے لئے چلا رہے ہیں لیکن عمائدِ سلطنت کے کانوں تک اس آواز کی رسائی نہیں ہو سکی۔ بہرحال، اگر اب بھی محترم خواجہ صاحب چاہتے ہیں کہ اس کمی کو عملاً پورا کیا جائے اور ملت کے قلوب و دماغ سے فی الواقعہ تعاون حاصل کیا جائے تو وہ اس کے لئے عملی اقدام کریں۔ طلوعِ اسلام کی خدمات اس اہم فریضہ کے لئے ہر وقت حاضر ہیں۔

---

(۳)

معلوم ہوا ہے کہ حکومت مغربی پنجاب نے اپنے تمام ملازمین سے ایک اقرار نامہ پر دستخط کرائے ہیں جس کی عبارت یہ ہے کہ

> میں مقدس قسم اٹھاتا ہوں کہ میں پاکستان کے اس کانسٹی ٹیوشن پر سچا یقین رکھتا ہوں اور اس کی وفاشعاری کا عہد کرتا ہوں جو بذریعہ قانون متمکن ہے۔ اور میں اپنے فرائض مفوضہ کو اپنی بہترین قابلیت، علم اور فیصلہ کے مطابق نہایت وفاداری اور ایمانداری سے سر انجام دوں گا۔

اس حلف نامہ کے پہلے حصہ کے متعلق دو ایک باتیں قابلِ غور ہیں۔ پہلے یہ کہ پاکستان کا وہ کونسا کانسٹی ٹیوشن ہے جس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک ہمارا علم ہماری راہ نمائی کرتا ہے، پاکستان کے کانسٹی ٹیوشن کی تدوین و ترتیب کے لئے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی بنی ہوئی ہے لیکن اس نے ابھی تک کوئی آئین مرتب نہیں کیا۔ اور جو آئین ابھی تک واضعینِ آئین کے دماغوں کے اندر بند ہے (اور خدا جانے وہاں بھی ہے یا نہیں) اس کی صداقت پر حلف لینے کے کیا معنی ہیں! اس وقت پاکستان کا آئین وہی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ہے جسے آپ خود اپنے لئے قابلِ قبول نہیں سمجھتے۔ اگر اسے آپ قابلِ قبول سمجھتے تو ایک جدید آئین کے وضع کرنے کی

ضرورت بھی نہ پڑتی۔

دوسرے یہ کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس سے قبل ملازمینِ حکومت سے کبھی اس قسم کے حلف نامے نہیں لکھوائے گئے۔ نہ معلوم وہ کونسی خصوصی مصلحت تھی جس کے ماتحت مغربی پنجاب کی حکومت کو ان حلف ناموں کی ضرورت لاحق ہوگئی۔

پھر یہ کہ اگر کانسٹی ٹیوشن کے اندر یہ شق رکھی جائے کہ اس قسم کے حلف ناموں پر دستخط کئے جائیں گے تو اور بات ہے۔ جب ابھی تک کانسٹی ٹیوشن میں ایسی کوئی چیز نہیں تو پھر اس بدعت کی کیا ضرورت تھی۔ اور یہ بھی کہ جب مرکزی حکومت نے اس قسم کی تدابیر اختیار نہیں کیں تو کسی صوبے کی حکومت کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ پاکستان کے کانسٹی ٹیوشن کی صداقت پر صوبائی حکومت کے ملازمین سے دستخط لے۔

بہر حال، ہمیں اس حلف نامہ کی علت سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارے نزدیک پاکستان کے ہر باشندے کا نصب العین پاکستان کا استحکام ہونا چاہئے۔ جو اس نصب العین سے اختلاف رکھتا ہے وہ پاکستان کا غدار ہے اور غداری کے جرم کی سزا کا مستحق۔ جو شخص اس نصب العین کے تحت پاکستان کا باشندہ بن کر رہے گا اسے پاکستان کا آئین بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ جو اس سے سرکشی برتیگا وہ حکومت کا باغی ہوگا اور جرم بغاوت کی پاداش کا سزاوار۔ بنا بریں، ملازمینِ حکومت سے خاص طور پر اس قسم کا حلف لینا مہمل ہے۔ باقی رہا حلف نامہ کا دوسرا جزو، یعنی فرائضِ مفوضہ کی سرانجامدہی۔ سو اس بات سے ہر ملازم واقف ہوتا ہے کہ اگر اس نے اپنے فرائض کو وفاشعاری اور دیانتداری سے سرانجام نہ دیا تو وہ قانونِ ملازمت کی خلاف ورزی کرے گا اور اپنے کئے کی سزا پائے گا۔ لہٰذا حلف نامہ کا یہ حصہ بھی بیکار ہے۔

نہ معلوم کیا بات ہے کہ یا تو ہمارے ہاں کسی کو کوئی نئی بات سوجھتی ہی نہیں اور اگر سوجھتی ہے تو اسقدر لچر اور پوچ۔

---

(۳)

برصغیر ہند کی دستاویزِ آزادی یعنی قانونِ ہند ۱۹۴۷ء نے جہاں پنڈت نہرو کو آزاد ہندوستان کا پہلا وزیرِ اعظم بننے کا موقع بخشا وہاں اس نے ہندوستانی ریاستوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ برطانوی اقتدار کے خاتمہ پر چاہیں تو ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کرلیں اور چاہیں تو آزاد رہیں۔ ہندوستان کو اپنی آزادی کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنا پاکستان کی تعیین اور ریاستوں کی موہوم یا ممکن علیحدگی کا غم ہوا۔ چنانچہ نہرو حکومت نے ادھر ریاستوں کی آزادی کو سلب کرنے کیلئے طرح طرح کی مشکلات پیدا کرنی شروع کیں اور ادھر تخویف و ترہیب سے ریاستوں کو ملحق کرنا شروع کردیا۔ اس کی یہ پالیسی کامیاب ثابت ہوئی۔ لیکن بالآخر حیدرآباد دکن کی ایک ریاست ایسی باقی رہ گئی جس نے ہندوستان سے الحاق منظور نہ کیا۔ ابتدائی مذاکرات کی ناکامی پر ہندوستان نے ریاست مذکورہ کی اقتصادی طرح کی بنیاد ڈال دی اور اسکی سرحدوں پر فوجیں بھی جمع کردیں۔ اس اقتصادی دباؤ اور فوجی مظاہرہ کے سلسلے میں از سرِ نو مذاکرات شروع ہوئے۔ ان کا نتیجہ ایک معاہدۂ استقرار کا (Standstill Agreement) کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ معاہدہ ایک سال

کے لئے نافذ العمل ہے۔ لیکن ہندوستان نے مطلقاً تکمیل مدت کا انتظار نہ کیا اور اس نشہ میں بدمست ہو کر کہ اس نے تمام سابق ہندو ریاستوں حتیٰ کہ پٹیالہ اور مشرقی پنجاب کی غیر مصالحت پسند ریاستوں تک کو مجبور کر دیا ہے۔ حیدرآباد کے مسلمان حکمران کا کانٹا اپنے پہلو سے ہمیشہ کے لئے نکالنے پر کمربستہ ہو گیا۔ مذاکرات کا دور سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستان کے شورش پسند عناصر حیدرآبادی ملک کے اندر مصروف فساد تھے، سرحدوں پر ہندوستانی فوجیں جمع تھیں اور ریاست کا اقتصادی مقاطعہ شدت سے جاری تھا۔ معاہدہ استقرار کار کی رو سے یہ تمام حربے خارج از بحث اور ناجائز تھے لیکن اخلاق اور آئین کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ نہرو نے یہاں تک دھمکی دی کہ اگر حیدرآباد بطیب خاطر الحاق پر رضامند نہ ہوا تو اس کا فیصلہ جنگ سے ہوگا۔

حیدرآباد جغرافیائی طور پر چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔ نہرو کے مخصوص علم جغرافیہ کی رو سے نہ پاکستان ہندوستان سے علیحدہ ہو سکتا تھا، نہ حیدرآباد ہندوستان میں آزاد رہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کی آبادی میں اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ لہٰذا نہرو ایسے ہندو جغرافیہ داں کی روش قابل فہم ہے۔ اس کے باوصف حیدرآباد مطالبہ آزادی پر قائم رہا اور ہندوستان کا حلقہ بگوش نہ بنا۔ اب کوئی دس ماہ کے مذاکرات یقینی ناکامی میں ختم ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی طرف سے جو غیر جمہوری اور غیر آئینی اقل قلیل، مطالبات پیش ہوئے وہ طفلانہ اور مضحکہ انگیز ہیں۔ خلاف توقع خود حیدرآباد نے یہ تجویز کی کہ الحاق و آزادی کا مسئلہ ریاستی استصواب سے طے کیا جائے۔ عام حالات میں ہندوستان یہ مطالبہ پیش کرتا۔ کیونکہ حیدرآباد میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ لیکن ہندوستان نے اس مسئلہ جمہوری حل کو ٹھکرا دیا، اور یہ مطالبہ کیا کہ حیدرآباد پہلے عارضی طور پر ہندوستان سے الحاق کر لے اور پھر استصواب کے ذریعہ الحاق کا فیصلہ کرے۔ یہ بدیہی امر ہے کہ الحاق کے بعد عام اس سے کہ وہ عارضی ہو یا مستقل، حقوقِ آزادی کالعدم ہو جاتا ہے۔ اگر عارضی الحاق ضروری ہے تو حیدرآباد پاکستان سے کیوں نہ الحاق کرے! ایسی صورت میں ہندوستان سے الحاق کا مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان کی طرف سے اس تجویز کا استرداد اس حقیقت کا آئینہ بردار ہے کہ حیدرآباد کی ہندو اکثریت نہرو اور پٹیل کی توقعات کے خلاف ہندوستان کے الحاق کے حق میں نہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہندوستان کا رویہ اور زیادہ قابل مذمت اور مستبدانہ ہو جاتا ہے۔

جوناگڑھ کے نواب نے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کیا تو ہندوستان نے اسے اس بنا پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ عوام کا جمہوری فیصلہ نہیں بلکہ نواب کا ذاتی فیصلہ ہے۔ کشمیر کے مہاراجہ نے عوام کے جذبات کو کچلتے ہوئے ہندوستان سے الحاق کا اعلان کیا تو ہندوستان نے نہ صرف اسے تسلیم ہی کر لیا بلکہ اس کے لئے باقاعدہ جنگ مول لے لی۔ حیدرآباد کے نظام نے الحاق کے خلاف فیصلہ کیا تو وہ تسلیم نہیں ہوا۔ نظام نے استصواب کی تجویز پیش کی تو وہ مسترد کر دی گئی۔ حالانکہ فیصلہ یا تو نظام کو کرنا چاہیئے یا ریاستی باشندوں کو۔ لیکن عجیب تماشا ہے کہ ہندوستان کو نہ نظام کا فیصلہ منظور ہے، نہ وہ عوام کا فیصلہ قبول کرنے پر تیار ہے۔ دراصل وہ ایک ہی فیصلہ چاہتا ہے اور وہ یہ کہ حیدرآباد ہندوستان کا حلقہ بگوش بن جائے۔ نہرو اور پٹیل ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ انہوں نے حالیہ تقریر میں اعلانیہ کہا ہے کہ حیدرآبادی تصفیہ کا حل یا الحاق ہے، یا حیدرآباد کا بحیثیت علیحدہ ریاست خاتمہ۔ انگریز ہندوستان سے رخصت ہو چکا مگر اس کی جوع الارض اور ہوس استیلا ہندوستان نے وراثت میں حاصل کر لی ہے۔ اب وہ اپنے علاوہ کسی اور کو آزاد دیکھنا نہیں چاہتا۔ اب تک حیدرآباد کے علاوہ تمام ہندوستانی ریاستیں ہندوستان سے ملحق ہو گئی ہیں۔ الحاق کے ساتھ انہوں نے تجزیہ کا بھی فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ فیصلے تمام کے تمام والیان ریاست نے کئے ہیں۔ کہیں بھی یعنی کسی ایک ریاست میں بھی ریاستی باشندوں سے استصواب کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ نہ اندرونی اصلاحات کو فیصلہ الحاق و تجزیہ کا پیش خیمہ قرار دیا گیا۔ چونکہ یہ فیصلے تمام کے تمام ہندوستان کے حق میں تھے اس لئے تسلیم کر لئے گئے۔

مذاکرات کی ناکامی کے بعد فیصلہ کی صرف ایک ہی امید باقی رہ جاتی ہے اور وہ ادارۂ اقوام متحدہ ہے۔ اس ادارہ نے کشمیر اور انڈونیشیا کے معاملات کو جس لطافت سے سلجھانے کی کوشش کی ہے اس کے پیش نظر معقول حل کے امکانات چنداں روشن نہیں۔ لیکن اب یہ معاملہ کسی تیسرے ـــ غیر جانبدار ـــ فریق کو ہی ہاتھ میں لینا چاہیئے۔ حیدرآباد کے آئینی حقوق کا فیصلہ بین الاقوامی عدالت سے کرایا جا سکتا ہے اور اس کی سیاسی حیثیت اقوام متحدہ سے متعین کرائی جا سکتی ہے۔ انڈونیشیا کی طرح اس مسئلہ کو ادارۂ مذکورہ کا کوئی رکن ادارہ میں پیش کر سکتا ہے اور اقوام متحدہ کی توجہ اس تصفیہ کی طرف دلا سکتا ہے۔ خود حیدرآباد اور ہندوستان کے مابین براہ راست مذاکرات کا وقت گذر چکا ہے۔ ہندوستان وہ اعتماد کھو چکا ہے جو ایک اچھے ہمسائے کو دوسرے اچھے ہمسائے پر ہوتا ہے۔ اب دنیا کی نگاہیں منتظر ہیں کہ

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا؟

سلیم کے نام ...

(بہ سلسلہ "اسلامی نظام")

تمہارا خط ملا۔ سچ پوچھو تو میں اس خط کا اُس دن سے انتظار کر رہا تھا جس دن تمہیں طلوعِ اسلام کا وہ پرچہ بھیجا ہے جس میں "اسلامی نظام" سے متعلق میرا مضمون شائع ہوا تھا۔ اس لئے تم نے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے وہ غیر متوقع نہیں اور نہ ہی وہ ذہنی انتشار اور فکری الجھاؤ جو ان شبہات کا محرک ہوا ہے۔ سلیم! تم ابھی نہیں جانتے کہ جو عقیدہ کسی قوم میں صدیوں سے متوارث چلا آ رہا ہو اور توارث اور ماحول کے موثرات سے انسان تحت الشعور (Sub- Conscious mind) کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا ہو، وہ کس طرح مبنی علی الحقیقت نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے اس قسم کے عقیدہ کی تائید میں دلائل و براہین بھی رکھتا ہو۔ لیکن یہ دلائل و براہین ذہنِ انسانی کے بعد کے تراشیدہ ہوتے ہیں۔ اس نے اس عقیدہ کو ان دلائل و براہین کی بنا پر اختیار نہیں کیا ہوتا۔ عقل کا منصب تحفظِ ذات (Preservation of Self) ہے اور شکست ہر انداز خواہ وہ علمی اور نظری میدان میں ہی کیوں نہ ہو، ضعفِ ذات کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے عقل، ہر اس عقیدہ کے لئے جو انسان نے غیر شعوری طور پر اختیار کر رکھا ہو، دلائل و براہین وضع کرتی رہتی ہے تاکہ فریقِ مقابل سے شکست کھا کر انسان کی ذات میں احساسِ کمتری (Inferiority Complex) نہ پیدا ہو جائے کہ احساسِ کمتری جذبۂ مرعوبیت کا موجب بنتا ہے اور جذبۂ مرعوبیت ضعفِ ذات کا سبب۔ اس لئے جب کبھی انسان کے سامنے کوئی ایسی بات آئی جس سے اس کے کسی عقیدہ کی تغلیط ہوتی ہو تو عقل کی طرف سے پہلا ردِ عمل اس نئے نظریہ یا اصول کی تردید ہوتا ہے۔ غیر شعوری طور پر اختیار کردہ عقائد کو منزہ عن الخطا سمجھ کر ان کے گرد حصارِ عافیت کھینچنے کی کوشش کا

نام تقلید اعمٰی ہے جو صحیح علم و بصیرت کی بدترین دشمن اور ہر دعوت الی الحق اور حرکت انقلاب کی اولیں مخالف ہوتی ہے۔ آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ ہر داعی الی اللہ کی دعوت حق و صداقت کے جواب میں یہی کہا گیا کہ جو عقائد ہمارے آبا و اجداد سے متوارث چلے آ رہے ہیں ہم انھیں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں — (وکذٰلک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا وجدنا آبائنا علیٰ امۃ وانا علیٰ آثارھم مقتدون ۲۳؎ ۔ اسی طرح اے رسول عربی! ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر وہاں کے سہل انگار طبقے نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایک مسلک پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی کے نقوش قدم پر چلتے ہیں)۔ لیکن سلیم! ذرا سوچو کسی عقیدہ کے صحیح ہونے کا یہ معیار کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف کے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے۔ اگر تپ دق کے جراثیم جو انسان کو اپنے اجداد سے وراثتاً ملے ہوں یقیناً اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انھیں فنا کر دیا جائے تو غلط معتقدات کے جراثیم ایسے مقدس کیوں تصور کر لئے جائیں کہ ان کی پرورش خون قلب و جگر سے کی جائے۔ حق و باطل کے پرکھنے کا معیار وہ کسوٹی ہے جو اللہ کی طرف سے وحی مبین کی شکل میں ہماری رشد و ہدایت کے لئے ہمیں عطا کی گئی ہے یعنی جو کچھ کہا ہے اسے اسی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو اور پھر نتیجہ پر پہنچو۔ یہ کہہ دینے سے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس عقیدہ کے خلاف ہے جو جمہور کو اسلاف سے ملا ہے نہ جمہور کے اس موروثی عقیدہ کو صحیح قرار دے سکتا ہے نہ میرے معروضات کا ابطال کر سکتا ہے۔ صحت و سقم کا معیار میزانِ قرآنی ہے۔ نہ میرا دعویٰ نہ غیر کی تردید۔ اس لئے اگر کوئی میری گذارشات کو باطل ٹھہراتا ہے تو اسے کہو کہ قرآن کی بارگاہ سے سند لائے۔ قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

سلیم! بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔ بڑھانے کو جتنی جی چاہے بڑھائے جائیے لیکن سمجھنے کے لئے بالکل واضح اور سادہ۔

ہم عشق کے ماروں کا، اتنا سا فسانہ ہے سمٹے تو میرا دل ہے پھیلے تو زمانہ ہے

تم تھوڑی دیر کے لئے یوں کرو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے بھی بھول جاؤ اور جو عقیدہ تمہیں وراثتاً ملا ہے اُسے بھی الگ رکھ دو (ثم تتفکروا) پھر خود غور کرو کہ قرآن تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ قرآن میں زنا کی سزا متعین ہے

لیکن شراب کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ اب اس سے یا تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن، شراب خواری کو جرم ہی قرار نہیں دیتا اس لئے اس کی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ لیکن یہ نتیجہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے اس لئے کہ

(۱) قرآن کی رو سے خمر (شراب) رجس من عمل الشیطان (۵/۹۰) ہے یعنی ناپاک فعل شیطانی۔

(۲) زنا کے متعلق اس کا ارشاد ہے کہ انہ کان فاحشۃ (۱۷/۳۲) وہ فحش کاری ہے۔

اور (۳) شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے۔ فانہ یامر بالفحشاء والمنکر (۲۴/۲۱)

اس لئے شراب بھی فواحش میں سے ہوئی (کیونکہ شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے اور شراب (خمر) شیطانی عمل ہے اس لئے جس طرح زنا فواحش میں سے ہے، فلہذا جرم، اسی لئے شراب فواحش میں سے ہے، فلہذا جرم۔ اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ منشائے قرآنی یہ ہے کہ شراب (خمر) کی کوئی سزا نہ ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شراب (خمر) کی سزا ضروری ہے تو قرآن نے اس کی سزا متعین کیوں نہیں کی جس طرح زنا کی سزا متعین کردی ہے۔

معترض کہہ سکتا ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) ناقص کتاب ہے۔ وہ کسی جرم کی سزا متعین کر دیتا ہے کسی کو غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔

ہمارے ہاں سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جن جرائم کی تعزیر (یعنی اجمال کی تفصیل) قرآن نے متعین نہیں کی، ان کی تعیین رسول اللہؐ نے کردی ہے اور اس طرح کتاب اللہ کی تکمیل ہوئی ہے۔ اس کا نام سنت قرار دیا جاتا ہے[1] اور دین سے مفہوم ہوتا ہے قرآن سنت۔

لیکن ذرا سوچو سلیم! کیا اس سے اس اعتراض کا واقعی جواب مل جاتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے؟ اعتراض یہ تھا کہ کیا خدا خود ان چیزوں کی تعیین نہیں کر سکتا تھا جو اُسے انھیں اس طرح غیر متعین چھوڑ کر دوسروں سے تکمیل کرانی پڑی؟ اسے کونسا امر مانع تھا کہ جس طرح زنا کی سزا متعین کردی تھی اسی طرح شراب (خمر) کی بھی تجویز کر دیتا۔ یا جس طرح روزوں کے مہینہ اور اوقات کی تخصیص کردی تھی، زکوٰۃ کی شرح بھی مقرر کر دیتا۔ مقام

[1] چونکہ شراب کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تجویز نہیں فرمائی بلکہ بعد میں حضرت عمرؓ نے متعین کی ہے اس لئے سنت کا مفہوم اور بھی وسیع کر دیا جاتا ہے جس میں نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے زمانہ کے اعمال و افعال سب شامل کئے جاتے ہیں۔

رسالت کی اس عظمت و رفعت کے باوجود جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ـــــ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ـــــ ذاتِ خداوندی کے متعلق یہ اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ اس نے ان تفاصیل و جزئیات کی خود تکمیل کیوں نہیں کی؟ یہ اعتراض ایسا قوی تھا کہ اس کے لئے ایک آفاقی سہارا ڈھونڈنا پڑا یعنی یہ عقیدہ وضع کرنا پڑا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کے مجموعہ کا نام قرآن ہے (اسے وحی متلو کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور دوسری وحی وہ جو قرآن سے باہر، رسول اللہؐ کی روایات میں ہے (اسے وحی غیر متلو کہتے ہیں کیونکہ اس کی تلاوت نہیں کی جاتی)۔ اس عقیدہ سے اس اعتراض کا جواب یوں مل گیا کہ ان جزئیات کی تعیین بھی خود خدا ہی نے کر دی ہے۔ البتہ وہ اصل کتاب (قرآن) میں نہیں بلکہ کتاب کے گویا ضمیمہ (Appendix) میں ہے (یعنی روایات میں)۔ ذرا سوچو سلیم! کہ یہ دلیل (یا عقیدہ) کس طرح روایتاً غلط اور درایتاً کمزور ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ وحی کی اس تقسیم کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی وہاں واضح طور پر موجود ہے کہ وحی وہی ہے جو قرآن میں ہے اور جس کی تلاوت کی جاتی ہے مثلاً سورۂ کہف میں ہے۔ واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک۔ لا مبدل لکلمٰتہ ولن تجد من دونہ ملتحدا۔ (۱۸/۲۷) تیرے رب کی کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر۔ کوئی اس کے لفظوں کو بدل نہیں سکتا۔ (اور اگر تو بھی بفرضِ محال ایسا کرے تو) اس کے سوا تو کہیں پناہ نہ پائے گا۔" سارے قرآن میں اس کا اشارہ تک موجود نہیں کہ خارج از قرآن وحی کہیں اور بھی ہے یا وحی کی کوئی دوسری قسم بھی ہے۔ البتہ یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں (متلو اور غیر متلو) اور وہیں سے یہ عقیدہ مسلمانوں نے مستعار لیا۔

پھر ذرا اسے بھی سوچو سلیم! کہ وحی کی اس تقسیم سے بالآخر مقصود کیا تھا؟ وہی خدا (وحی کا بھیجنے والا)۔ وہی رسول (جس پر وحی بھیجی جاتی تھی) وہی زبان (جس میں وحی نازل ہوتی تھی)۔ وہی مخاطب (جن کی ہدایت کے لئے وحی آتی تھی) دونوں وحیوں کی حیثیت بھی برابر (مثلہ معہ) لیکن اس کے باوجود کچھ وحی قرآن میں اور کچھ وحی قرآن سے باہر۔ یہ حکم کہ اتوا الزکوٰۃ (زکوٰۃ دو) قرآن میں اور یہ حکم کہ زکوٰۃ بشرح اڑھائی فیصدی دو، قرآن سے باہر۔ کیا قرآن میں "اڑھائی فی صدی" کے الفاظ نہیں لائے جا سکتے تھے؟ کیا اس سے قرآن

کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا؟ سوچو سلیم! کہ اس تقسیم خداوندی میں کونسی مصلحت تھی! یہ تو ہوا عملِ خداوندی کے متعلق عقیدہ کہ اس نے وحی کی اس طرح تقسیم کردی! اب اس کے بعد عملِ رسالت دیکھئے کہ اس عقیدہ کی روسے حضورؐ نے وحی کی ایک قسم (متلو) کے متعلق تو اتنی احتیاط برتی کہ اسے تمام وکمال لکھوادیا۔ شروع سے اخیر تک، اسی ترتیب کے مطابق جس میں یہ کتاب ہے، حفاظ کو زبانی یاد کرادیا۔ ان کے حفظ کردہ کو بار بار سن لیا۔ اور اس طرح یہ وحی قرآن کی دفتین میں محفوظ کرکے امت کو دیدی۔ باقی رہی وحی کی دوسری قسم (روایات) سو اسے نہ کہیں لکھوایا۔ نہ کسی کو یاد کرایا۔ نہ اس کا کوئی مجموعہ مرتب کیا۔ نہ اس کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا بلکہ اگر کسی نے از خود تبرکاً کچھ لکھنا بھی چاہا تو اسے روک دیا کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن (مسلم) مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو۔ ذرا غور کرو سلیم! کہ دین نام رکھا جاتا ہے قرآن (وحی متلو) سنت (وحی غیر متلو) کا۔ اور دین کے جزو اول کی حفاظت کا تو اس قدر انتظام واہتمام کیا جاتا ہے اور جزو ثانی کو اس طرح لاوارث چھوڑ دیا جاتا ہے! کیا اس سے رسول اللہؐ کے منصبِ رسالت (دینِ خداوندی کو انسانوں تک پہنچانے) پر (معاذ اللہ) حرف نہیں آتا؟ کہا جاتا ہے کہ عربوں کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ سب کچھ زبانی یاد کرلیا کرتے تھے اس لئے روایات کو لکھوانے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس پر تو غور کرو کہ اگر عربوں کا حافظہ ایسا ہی قابلِ اعتماد تھا تو پھر قرآن کو کیوں لکھوایا گیا؟ اور پھر یہ بھی کہ جس طرح قرآن کو لفظاً لفظاً یاد کرایا گیا اور ان کے یاد کئے کی تصدیق کی گئی، اسی طرح روایات کو بھی کیوں نہ یاد کراکر ان کی تصدیق کردی گئی! "وحی غیر متلو" کی تدوین وتحفظ کے بارے میں عملِ خداوندی اور عملِ رسالت تم دیکھ چکے۔ اب عملِ خلفائے راشدین دیکھئے۔ انھوں نے حضورؐ کی وفات کے بعد ایک کمیٹی بٹھائی جس نے قرآن کے ان تمام متفرق نوشتوں کو جو لوگوں نے انفرادی طور پر رکھ چھوڑے تھے اکٹھا کیا۔ ان کی جانچ پڑتال کی۔ رسول اللہؐ کے ہاں جو نوشتوں کا مجموعہ تھا اس سے ان کی تطبیق کی۔ حفاظ سے ان کی ترتیب کی تصدیق کرائی۔ اس طرح ایک مجموعہ مرتب کرکے اسے باقی تحریروں سے الگ کرلیا۔ پھر اس مجموعہ کی مصدقہ نقول سلطنت کے مختلف گوشوں میں پہنچائی گئیں اور اس کا حکم دیدیا کہ جہاں کہیں کوئی اختلاف ہو، اس مصدقہ مجموعہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ کچھ انھوں نے دین کے ایک جزو (وحی متلو۔ یعنی قرآن) کے متعلق کیا لیکن دین کے دوسرے جزو (وحی غیر متلو۔ یعنی احادیث) کے متعلق صرف یہ کہ خود

کچھ نہ کیا بلکہ جہاں کہیں معلوم ہوا کہ کوئی شخص انفرادی طور پر ان کی تحریر و روایت کی کوشش کر رہا ہے اسے اس سے روکا اور عند الضرورت اس پر سخت مواخذہ بھی کیا۔ تفصیل اس کی تم کئی بار سن چکے ہو) ذرا سوچو سلیم! کہ یہ تمام تصریحات تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتی ہیں! کیا لامحالہ تم اس نتیجہ تک نہیں پہنچتے کہ یہ عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ نہ یہ منشائے خداوندی تھا نہ منشائے رسالت اور نہ مسلکِ خلافت راشدہ۔ اس تمام عہد میں وحی کی ایک ہی قسم تسلیم کی جاتی تھی جو قرآن میں محفوظ تھی۔ یہی اللہ نے رسولؐ کو دیا۔ اسی کو رسولؐ نے امت تک پہنچایا اور اسی کو صحابہؓ نے آگے بڑھایا۔

اب یہ دیکھو کہ اس غلط عقیدہ نے دین میں خرابیاں کس قدر پیدا کیں! قرآن اپنی محفوظ شکل میں امت کے پاس موجود تھا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی تھی۔ اس لئے اس میں ایک حرف کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس روایات کا کوئی مصدقہ مجموعہ امت کے پاس نہ تھا لیکن انھیں اس عقیدہ کی رو سے قرآن کا ہم پلہ قرار دیا گیا تھا۔ اب سوچئے کہ اس سے دین میں کس قدر تحریف و الحاق کا دروازہ کھل گیا۔ جس کا جی چاہتا کوئی حکم اپنی طرف سے وضع کرتا اور اس کے ساتھ دو چار راویوں کے نام کا اضافہ کر کے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منسوب کر دیتا، اور یہ حکم دین کا جزو بن جاتا۔ کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اس کی پرکھ کر سکتا کہ یہ واقعی قولِ رسولؐ ہے یا خود ساختہ روایت۔ معیار تھا تو یہ کہ جن دو چار راویوں کے نام بطور اسناد شامل کئے گئے ہیں وہ ان پرکھنے والوں کے معیارِ ثقاہت پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ غور کرو سلیم! کہ جس دین (قرآن) کو خدا اور اس کے رسولؐ نے اتنی احتیاط اور حفاظت سے دیا تھا اس دین میں تحریف و الحاق کے کتنے بڑے فتنہ کا دروازہ کھل گیا۔ قرآن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے کہ آپ کو بھی اس کی مجال نہ تھی کہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکتے۔ قل مایکون لی ان ابدلہ من تلقائ نفسی۔ ان اتبع الا ما یوحی الی (۱۰/۱۵) ”ان سے کہدو کہ میری کیا مجال ہے کہ میں قرآن میں اپنی طرف سے کچھ تغیر و تبدل کر دوں۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے“۔ اور دوسری جگہ ہے کہ ولو تقول علینا بعض الاقاویل۔ لاخذنا منہ بالیمین۔ ثم لقطعنا منہ الوتین (۶۹/۴۴-۴۶) ”اگر رسول کسی بات کو یونہی ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم

اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگِ جان کاٹ ڈالتے"۔ لیکن اب واضعین حدیث کو کھلی چھٹی تھی کہ جو جی میں آئے وضع کریں اور اسے رسول اللہ تک منسوب کردیں اور جب ان سے کہا جائے کہ یہ تعلیم قرآن میں تبدیلی ہے یا اس پر اضافہ جس کے رسول اللہ مجاز نہ تھے تو اس کا کھلا ہوا جواب موجود تھا کہ یہ تبدیلی یا اضافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے نہیں کیا۔ یہ تو وحی غیر متلو کے ذریعہ سے کیا تھا جو خدا ہی کی طرف سے تھا اس لئے یہ تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس "وحی غیر متلو" نے نہ صرف ان جزئیات ہی کو ابدی طور پر متعین کردیا جنہیں قرآن نے غیر متعین رکھا تھا بلکہ قرآن کی متعین کردہ جزئیات میں ترمیم و تنسیخ بھی کردی۔ مثلاً قرآن نے زانی کی سزا سو دُرّے مقرر کی ہے۔ روایات (وحی غیر متلو) نے کہدیا کہ یہ سزا غیر شادی زانی اور زانیہ کی ہے شادی شدہ کی سزا سنگسار ہے۔ یا قرآن نے کہا تھا کہ ہر شخص اپنے مال کے بارے میں وصیت کرسکتا ہے لیکن روایات (وحی غیر متلو) نے کہدیا کہ یہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی وارثین کے حق میں نہیں۔ وقس علی ہذا۔ یعنی پہلے تو صرف اتنا ہی اعتراض تھا کہ قرآن نے ان احکام کی جزئیات بھی خود ہی متعین کیوں نہیں کیں اس لئے یہ کتاب (معاذ اللہ) ناقص ہے۔ لیکن وحی غیر متلو کے عقیدہ نے یہ بھی کہدیا کہ جن جن احکام کی تفاصیل قرآن نے متعین کی ہیں وہ بھی ناقص ہیں۔ اور ان کی تکمیل و ترمیم وحی غیر متلو کے ذریعہ ہوتی ہے جس کا دروازہ (کم از کم) امام بخاری اور مسلم کے زمانہ تک ضرور کھلا تھا۔

کیوں سلیم! کچھ بات سمجھ میں آئی؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے دل میں بار بار یہ خلجان پیدا ہو رہا ہے کہ (۱) اس اعتراض کا صحیح جواب تو ابھی تک سامنے نہیں آیا کہ قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین کیوں چھوڑ دیا اور (۲) یہ کہ وحی غیر متلو کا عقیدہ مسلمانوں میں کس طرح رائج ہو گیا! اگر تم نے اصل مضمون کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہوتا تو ان اعتراضات کے جواب بھی وہیں سے مل جاتے۔ لیکن اس دفعہ تو تم نے بھی وہی کچھ کیا جو عوام کیا کرتے ہیں کہ جونہی کوئی خیال ایسا سامنے آیا جو ان کے کسی مروجہ عقیدہ کے خلاف ہو، انہوں نے بلا سوچے سمجھے اعتراضات شروع کردیئے۔ یہ روش تو تمہاری فطری افتاد کے خلاف تھی۔ لیکن تمہاری معذوری پر میری نگاہ ہے۔ جو عقائد نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آئیں وہ انسان کے نفسِ غیر شعوری کی گہرائیوں میں مسلّم صداقتیں بن کر جاگزیں ہو جاتے ہیں اور آسانی سے اپنی جگہ نہیں چھوڑتے۔ اس لئے اب آؤ ان

اعتراضات کی طرف۔

تم جانتے ہو کہ قرآن، تمام دنیا کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے ضابطۂ قانون ہے۔ قانون میں ایک چیز ہوتی ہے اصول اور ایک چیز فرع۔ قرآنی ضابطۂ قانون کے اصول فطرتِ انسانی کے مطابق ہیں اور چونکہ فطرتِ انسانی غیر متبدل ہے اس لئے وہ اصول بھی ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ لیکن ان اصولوں کی فروعات، انسان کی تمدنی زندگی کے ان عملی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں جو مختلف زمانوں کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ فروعات غیر متبدل نہیں ہو سکتیں۔ قرآن نے (بجز چند ایک فروعات کے) انسانی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق قوانین کے اصول بنائے ہیں، ان کی جزئیات خود ہی متعین نہیں کر دیں۔ اس لئے کہ قرآن کا ایک ایک حرف غیر متبدل ہے۔ (لا تبدیل لکلمات اللہ) اگر قرآن جزئیات خود ہی متعین کر دیتا تو ان میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تغیر و تبدل نہ ہو سکتا۔ (جیسا کہ ان چند جزئیات میں نہیں ہو سکتا جو اس نے متعین کر دی ہیں اور جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ منشائے ایزدی ہی تھا کہ انہیں غیر متبدل رکھا جائے)۔ اس لئے یہ ضابطۂ قانون (جس میں تمام جزئیات تک بھی غیر متبدل ہوتیں) کبھی تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حیات قرار نہ پا سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہودیت، عیسائیت، ہندومت وغیرہ آج اس طرح سے ناکام کیوں ہوئے ہیں؟ انہیں کیوں ان کے اپنے پیروؤں نے چھوڑ دیا ہے۔ انہوں نے انہیں خوشی سے نہیں چھوڑا ۔۔۔ انتہائی مجبوری کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ وہ مجبوری کیا تھی؟ یہی کہ کسی زمانہ میں جو مذہبی رسوم و قیود (یعنی جزئیاتِ قانون) متعین ہوئیں وہ ان مذاہب میں غیر متبدل قرار پا گئیں۔ اب وہ جزئیات عصرِ حاضر کے انسانوں کے تمدنی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں۔ اربابِ مذہب، اس عقیدہ کی بنا پر کہ وہ غیر متبدل ہیں، ان کی پابندی پر مصر تھے۔ کچھ عرصہ یہ کشمکش رہی اور بالآخر ان کے معتقدین، وقت کے اٹل تقاضوں سے ایسے مجبور ہوئے کہ انہیں ان جزئیات کو جھٹک کر پھینک دینا پڑا اور چونکہ ان کی آسمانی کتاب ان کے پاس اپنی اصل شکل میں تھی نہیں اس لئے ان جزئیات کے ساتھ ہی مذہب بھی گیا (دراصل ان کے ہاں مذہب نام ہی ان جزئیات کا رہ گیا تھا)۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ یہودیوں کو تالمود کی جزئیات، عیسائیوں کو سینٹ پال کی جزئیات اور ہندوؤں کو منوجی کی جزئیات، جنہیں ابدی اور غیر متبدل کہا جاتا تھا، کس طرح زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر الگ کرنی

قرآن کے پیشِ نظر جہاں فطرتِ انسان کی غیر متبدل اساس تھی وہاں اس کی تمدنی زندگی کے ہمیشہ بدلنے والے تقاضے بھی تھے۔ اس لئے اس نے ایسا ضابطۂ حیات دیا جس میں انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا تھا اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر اس میں نوعِ انسانی کے لئے ابدی ضابطۂ حیات بننے کی صلاحیت ہے۔ لہذا یہ ظاہر ہے سلیم! کہ قرآن نے جزئیات کو اس لئے متعین نہیں کیا کہ وہ انھیں قابلِ تغیر و تبدل رکھنا چاہتا تھا۔ اگر کسی زمانہ میں متعین شدہ جزئیات ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنی مقصود ہوتیں تو قرآن انھیں خود ہی متعین کر دیتا۔ لہذا قرآن کے غیر متعین جزئیات کو کسی زمانہ میں متعین کر کے انھیں آئندہ کے لئے غیر متبدل قرار دیدینا دین کی اس صلاحیت کو سلب کر لینا ہے جس کی بنا پر یہ ابدی طور پر ضابطۂ حیات بن سکتا تھا۔ ذرا سوچو سلیم! کہ اگر کسی اسلامی حکومت کو یہ مجبوری ہو کہ وہ کسی حالت میں بھی اڑھائی فیصدی سے زیادہ انکم ٹیکس عائد نہیں کر سکتی اور وہ ٹیکس (زکوٰۃ) بھی سال بھر کے فاضل اثاثہ (Surplus Assets) پر ہوگا تو وہ حکومت کبھی چل سکتی ہے؟ قرآن نے زکوٰۃ کا حکم دے کر اس کی شرح و قیود کو غیر متعین چھوڑ دیا تا کہ ہر زمانہ کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اسے خود متعین کرتی رہے۔ قرونِ اولیٰ میں خلافتِ راشدہ نے اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق اڑھائی فیصدی مناسب سمجھا اس وقت یہی شرح، شرعی تھی۔ اگر آج کوئی اسلامی حکومت کہے کہ اس کی ضروریات کا تقاضا بیس فی صدی ہے تو یہی بیس فیصدی شرعی شرح قرار پا جائے گی۔

یہ ہے وہ مصلحت سلیم! جس کی بنا پر قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین چھوڑ دیا۔ اب کسی وقت کی متعین کردہ جزئیات کو ابدیت سے ہمکنار کر دینا اس دینِ فطرت کو غیر فطری بنا دینا ہے۔ سلیم! تم مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہو کہ عصرِ حاضر کا مسلمان اگر مذہب سے بیگانہ بلکہ سرکش ہو رہا ہے تو اس لئے کہ اسے ان جزئیات کو ماننے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو اس کے موجودہ زمانہ کے تقاضوں میں (مذہبہم) نہیں ہوتیں۔ اگر قرآن کے اصول اس کے سامنے رکھکر اس سے کہا جائے کہ ان اصولوں کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے والی جزئیات خود متعین کرو، تو دیکھو وہ کس طرح لبیک! اللھم لبیک کہتا ہوا اس حریمِ فطرت کے گرد مستانہ وار طواف کرتا ہے۔ قرآن کی تو کیفیت یہ ہے

سلیم! کہ

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

اب دوسری شق لیجئے یعنی یہ کہ یہ جزئیات، غیر متبدل کس طرح قرار پاگئیں۔ اسی کو بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ وحی غیر متلو کا عقیدہ کیسے پیدا ہوگیا۔

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے، قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ ہر زمانہ کی اسلامی حکومت، اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ان کا تعین خود کرلے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی حکومت کی تشکیل فرمائی لہٰذا حضورؐ نے سب سے پہلے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متعین جزئیات کو متعین فرمایا۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں ان جزئیات میں حسبِ ضرورت اضافے بھی ہوتے رہے اور ترمیمات بھی۔ سلیم! تم حیران ہو گے کہ وحی غیر متلو کے عقیدہ کا سراغ نہ رسول اللہؐ کے زمانے میں کہیں ملتا ہے نہ صحابہؓ کے عہد میں۔ وہ زمانہ اس اصطلاح تک سے ناواقف نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک وحی ایک ہی تھی اور وہ قرآن میں محفوظ تھی۔ اس سے باہر وحی کہیں نہ تھی اس لئے خارج از قرآن کوئی چیز غیر متبدل بھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی اور سلاطین نے امورِ سلطنت اپنے ذمہ رکھ لئے اور امورِ دین کو انفرادی طور پر علماءؑ[1] کے سپرد کردیا تو قرآنی اصولوں کے جزئیات متعین کرنے کا جو اسلوب قرآن نے بتایا تھا (یعنی بذریعہ حکومت) وہ خود بخود مٹ گیا جن لوگوں کے ذمہ امورِ دین کا تحفظ قرار پایا، انھوں نے سوچا کہ مرکزی قوت (حکومت) نے جزئیات کو

---

[1] سلیم! تم حیران ہوگے کہ علماء کا ایک جداگانہ طبقہ اور مولوی اور مولانا کے الفاظ نہ عہدِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کہیں دکھائی دیتے ہیں نہ زمانہ خلافتِ راشدہ میں۔ یہ بھی اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب سلطنت دین سے الگ ہوگئی اور "قیصر اور پوپ" کے دوائرِ منصب جداگانہ قرار پاگئے۔ "حضرت مولانا ابوبکر صدیقؓ" اور "حضرت مولوی عمر فاروقؓ" آج بھی کس قدر نامانوس نظر آتے ہیں۔

قانون کی حیثیت دیگر نافذ کرنے کا فریضہ ترک کر دیا ہے۔ اس لئے اگر مروجہ جزئیات کے متعلق یہ کہدیا گیا کہ وہ صرف اس زمانہ کے لوگوں کے لئے شریعت ہیں جن کے لئے انھیں اختیار کیا گیا تھا تو ملت شریعت کے بغیر رہ جائے گی اور اس طرح ان میں سخت انتشار (Anarchy) پھیل جائے گا۔ لہذا ملت کو کسی آئین پر پابند رکھنے کا یہی طریقہ تھا کہ اس وقت کے مروجہ جزئیات کو غیر متبدل قرار دے کر واجب التعمیل ٹھہرا دیا جائے۔ ان کو غیر متبدل قرار دینے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ یہ کہ انھیں تمام و کمال ذات رسالتمآب کی طرف منسوب کر دیا جاتا۔ اور یہ کہدیا جاتا کہ حضورؐ نے انھیں بذریعہ وحی متعین فرمایا تھا اس لئے یہ ابدی طور پر ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ انھیں وحی قرار دینے میں یہ بھی مصلحت تھی کہ جو لوگ ذاتی اجتہادات سے مسائل میں استنباط کر کے جزئیات متعین کر رہے تھے (یعنی اہلِ فقہ) اس سے ان کے رد کی ناقابلِ تردید دلیل مل جاتی تھی۔ یعنی ایک چیز کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اسے حضورؐ نے بذریعہ وحی متعین فرمایا اور دوسری کے متعلق یہ کہ اسے (مثلاً) امام ابو یوسفؒ نے اپنی رائے سے متعین کیا تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کی جبینِ عقیدت اول الذکر کے سامنے جھکے گی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں سلیم! جزئیات کو غیر متبدل قرار دینے کا اولین جذبہ محرکہ یہی تھا۔ یعنی ملت کو بالکل بے زمام چھوڑ دینے یا اشخاص کی ذاتی آراء کے تابع کر دینے کے بجائے انھیں تقلید کی حدود میں مقید کر دیا جائے۔ یہ طریقہ ایک اضطراری حالت کے لئے وقتی علاج تو ضرور تھا لیکن اس سے وضعِ احادیث کا اتنا بڑا دروازہ کھل گیا کہ جو کچھ کسی کے جی میں آیا اس نے قال رسول اللہ کے عنوان سے دو چار رواۃ کی تائید کے ساتھ گھڑا اور اسے جزو دین بنا دیا۔ اب یہی دین ملت کے لئے ابدی طور پر ناقابلِ تغیر شریعت بن گیا۔ جب تک حکومت اور مذہب کی یہ تفریق باقی رہی یہ سوال عملی طور پر بے معنی تھا کہ یہ جزئیات جو تقلیدی طور پر اسلاف سے منتقل ہوتی آرہی ہیں علیٰ حالہٖ رہنی چاہئیں یا ان میں تغیر و تبدل ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ حکومت سے الگ ہٹ کر یہ جزئیات مذہبی رسوم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ زکوٰۃ اڑھائی فیصدی ہوتی یا چالیس فیصدی، دونوں صورتوں میں خیرات سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اب بھی جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے لیکن مذہب، حکومت سے الگ ہے، وہاں ان جزئیات کی حیثیت مذہبی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لئے اس سے پہلے اس سوال نے عملی حیثیت اختیار نہیں کی۔ یہی وجہ ہے سلیم! کہ میں خود، باوجود

اپنے اس مسلک کی اس قدر پرزور تائید واشاعت کے، مذہبی جزئیات میں مروجہ مسلک دفقہی آئین کا... پابند چلا آرہا ہوں لیکن حصول پاکستان کے بعد یہ آواز ہر درو دیوار سے اٹھنی فروع ہوئی ہے کہ اس کا آئین شرعی ہونا چاہئے (اور یہی تشکیل پاکستان کا مقصد بھی ہے) لہٰذا اب اس سوال نے بھی عملی شکل اختیار کرلی ہے۔ کہ یہ جزئیات، جو مذہبی رسوم کی صورت میں ہمارے ہاں متوارث چلی آرہی ہیں، ناقابلِ تغیر ہیں، یا زمانہ کے مقتضیات کے مطابق ان میں تغیر و تبدل بھی ہوسکتا ہے۔ جو لوگ دل سے چاہتے بھی ہیں کہ یہاں نظامِ شریعت رائج کیا جائے وہ بھی اس خیال سے لرزاں و ترساں ہیں کہ اگر شریعت انہی جزئیات کے مجموعہ کا نام ہے جسے اربابِ شریعت ناقابلِ تغیر قرار دے رہے ہیں، تو پاکستان کا نظام چل کیسے سکے گا؟ اور اربابِ شریعت کا ایمان ہے کہ یہ جزئیات ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ انھیں چھوڑا تک نہیں جاسکتا۔ اس لئے انھیں اسی طرح اختیار کرنا ہوگا۔ اس سے حکومت چلتی ہے یا نہیں۔ اس سے انھیں کچھ واسطہ نہیں۔ تقلید کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لیا جاتا ہے اور اعمال کو کبھی نتائج سے نہیں پرکھا جاتا۔ تمہیں یاد ہے ایک دفعہ دہلی میں ہم ایک پریس میں گئے تھے۔ وہاں ایک بہت بڑی روٹری مشین پوری سرگرمی سے چل رہی تھی۔ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر، بڑے زور و شور کے ساتھ لیکن اس کے تختہ پر کاغذ نہیں تھا اس لئے مشین چل رہی تھی لیکن چھپ کچھ نہیں رہا تھا۔ مسلمانوں کے اعمالِ مذہبی کی مشین صدیوں سے چل رہی ہے لیکن اس پر چھپ کچھ نہیں رہا۔ اولٰئک حبطت اعمالھم (ان کے عمل بے نتیجہ رہتے ہیں) اور ضل سعیھم (اُن کی کوششیں رائگاں)۔ لیکن اب سلیم! خدا خدا کرکے ہمیں ایک ایسا موقعہ ملا ہے کہ جس میں حکومت ہمارے ہاتھ میں ہے لیکن ملوکیت کا استبداد و تغلب ہم پر مسلط نہیں ہوا۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ جس قسم کا آئین چاہیں بنالیں۔ صدیوں کے بعد پھر وہ وقت آیا ہے کہ ناموس فطرت ہم سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اگر سلیم! اس وقت ہم نے مبداء فیض کی اس موہبتِ کبریٰ سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر قرآن ہماری زندگی کا ضابطۂ حیات کبھی نہیں بن سکے گا۔ اور ہم آزادی کی فضائے لبیط میں کبھی سانس نہیں لے سکیں گے۔ ہیں سلیم! تمہیں

اپنا سینہ چیر کر اپنے درد و کرب کی ان تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں جنھوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ سلیم

میرے دیدۂ ترکی سب بے خوابیاں — میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز

تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں پاکستان کے وسیع و عریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ

نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق

اور ایک ٹھنڈی سانس سے یہ کہکر خاموش ہو جاتا ہوں کہ

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

مجھے سلیم! یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ ہمارے نظامِ شریعت کے دعویداران وہی ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ فقہ و روایات کی وہ جزئیات جو ہزار سال پیشتر زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھکر مرتب کی گئی تھیں، ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ اس لئے وہ انہی جزئیات کے مجموعہ کو قانونِ شریعت بتا کر سامنے لے آئیں گے جو آج کے حالات میں کبھی قابلِ عمل نہ ہو سکے گا۔ اور مسلمان اس سے ایسا بدکیگا کہ دوبارہ اس کی طرف رُخ نہیں کرے گا۔ اور اس طرح اللہ کی یہ نعمتِ عظمیٰ ہماری شامتِ اعمال سے بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔ یہ صرف ہم پر ہی ظلم نہیں ہوگا بلکہ تمام نوعِ انسانی پر ظلم ہوگا کہ اس سے انسانیت اس نور سے محروم رہ جائیگی۔ جس میں اس سفر کی ترتیب شرف و مجد کی ارتقائی منازل طے کرنی تھیں۔ و ذالک خسران المبین۔

سلیم! تم کہتے ہو کہ جب اصولِ قانون، اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے اور ان کی جزئیات امت نے اپنے اپنے زمانہ میں متعین کیں تو رسولؐ پر ایمان لانے سے کیا مفہوم ہوگا! تمہارے اس سوال پر مجھے حیرت ہوئی اس لئے کہ تم کبھی اس قسم کا سطحی اعتراض نہیں کیا کرتے تھے۔ ذرا سوچو کہ جب ایک مسلمان کہتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ تو اس کے پاس اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ تاریخ شاہد ہے (اور اس کا مسلمان کو خود اقرار ہے) کہ دنیا کو قرآن محمدؐ ابن عبداللہ نے دیا تھا۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہوا؟ اس کا صرف ایک ثبوت ہے کہ

خود محمدؐ ابن عبداللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ کلام میرا نہیں، خدا کا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہ لائے۔ قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اور قرآن ہی حکومتِ خداوندی کا ضابطہ قانون ہے۔ اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان اس وقت تک وجہ شرف انسانیت ہے جب تک انسان اللہ کی حکومت کو باعث احترام آدمیت سمجھتا ہے۔ پھر اسے بھی سوچئے سلیم! کہ اس حقیقت سے بھی تو ہمیں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آشنا کرایا کہ قرآنی اصولوں کی جزئیات خود ہم نے متعین کرنی ہیں۔ اگر حضورؐ انہیں متعین کر کے حکومتِ خداوندی کو متشکل نہ فرماتے تو ہمیں کیا معلوم ہوتا کہ منشائے خداوندی کیا ہے؟

گر عشق نہ بودے و غم عشق نہ بودے — اینہا سخن نغز کہ گفتے کہ شنودے

لیکن حضورؐ کی سیادت تو اسی میں تھی کہ آپ نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر دیا اور اس طرح اسے صحیح حریت فکر و نظر عطا کر کے اسے ان اغلال و سلاسل کی پابندیوں سے آزاد کر دیا۔ جس میں وہ جکڑا چلا آتا تھا۔ یہ اغلال و سلاسل وہ استبداد تھا جو ملوکیت اور برہمنیت کی شکل میں انسانی اعصاب پر سوار چلا آتا تھا۔ حضورؐ نے یہ بتایا کہ انسان کا تعلق اس کے خدا کے ساتھ براہ راست ہے اور خدا اور بندے کے درمیان، اور تو اور، خدا رسول بھی حائل نہیں ہو سکتا۔ یہ انداز حکومت کہ اصول خدا نے متعین کئے ہیں اور ان کی جزئیات انسان خود متعین کریں گے، خدا اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ ہے وہ عدیم المثال تعلیم جسے قرآن نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ

ماکان لبشر ان یؤتیه الله الکتاب والحکم والنبوة ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون الله۔ ولکن کونوا ربنیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون۔ ۳/۷۸

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکومت و نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے خدا سے ورے میرے بندے بن جاؤ۔ (اس کا شیوہ یہ ہو گا کہ وہ لوگوں سے کہے کہ) تم سب ربانی انسان بن جاؤ (اور اس کا طریق یہ ہے کہ) تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے

رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

رسول کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے فقید المثال عمل سے انسانوں کو یہ سکھاتے کہ وہ کس طرح ربانی انسان بن سکتے ہیں یعنی ان کا اور ان کے خدا کا براہ راست تعلق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس تعلق کا ذریعہ کتاب اللہ ہے۔ اس تعلق کی عملی شکل پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعین کر کے دکھائی۔ آپ کے بعد آپ کی امت نے اس تعلق کو مسلسل قائم رکھنا تھا۔ لیکن امت بہت جلد اس راستہ سے بھٹک گئی۔ اور اس نے اپنے اور خدا کے درمیان وہی انداد (غیر خدائی قوتیں) حائل کر لئے جنھیں درمیان سے ہٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اور جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہٹا کر دکھا دیا تھا۔ یہ انداد من دون اللہ کہیں ارباب سیاست تھے اور کہیں احبار و رہبان۔ جنہوں نے خدائی احکام کی جگہ اپنے احکام کی پرستش کرائی۔ کسی نے قیاسات کی رو سے کسی امام کا آسرا لیکر اور کسی نے روایات کے راستے خود رسول اللہ کا سہارا پکڑ کر۔ حالانکہ نہ ان ائمہ نے اس کی تلقین کی تھی اور نہ رسول اللہ نے اس کی تعلیم دی تھی۔ تو پھر سلیم! کوئی تو وقت ایسا آنا چاہئے جب امت کو اس بے راہ روی سے روک کر اسے اس راستہ پر لگایا جائے جس سے اس کے اور اس کے خدا کے درمیان پھر براہ راست تعلق پیدا ہو جائے۔ میرے نزدیک پاکستان نے وہ موقعہ ہم پہنچا دیا ہے۔ لیکن اگر اب بھی ہمارے اور ہمارے خدا کے درمیان وہی انداد من دون اللہ حائل رہے۔ یعنی یا حکومت ارباب سیاست کے اپنے تصورات کے مطابق قائم ہو گئی یا ہمارے احبار و رہبان کے اشخاص پرستی کے معتقدات کے مطابق تو پھر خدا اور بندے کا ٹوٹا ہوا رشتہ شاید دوبارہ نہ جڑ سکے۔

یہ خدشہ ہے سلیم!

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیوں۔ اور میرے دل کی پوشیدہ بے تابیوں

کا باعث۔

اس آخری ٹکڑہ سے سلیم! تم نے یہ بھی سمجھ لیا ہو گا کہ "اسلامی نظام" محض چند قوانین کے مجموعہ کا نام نہیں جو کسی قوم (یا ایک حکومت کے تابع آجانے والے انسانوں) کے اجتماعی زندگی میں نظم و ضبط

قائم رکھنے کے لئے میکانکی طور پر نافذ کر دیئے جائیں گے۔ قانون کیا ہے؟ انسانوں کو ان افعال سے روکنے کا ذریعہ جن سے ان کی تمدنی زندگی میں فساد و انتشار واقعہ ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف قوموں (یا جماعتوں اور سلطنتوں) نے مختلف انداز و طرق (قوانین) وضع کئے ہیں۔ ان میں اکثر قوانین مشترک بھی ہیں۔ مثلاً قاتل کی سزا (موت) انگریز کے قانون میں بھی وہی ہے جو قرآن کے قانون میں ہے۔ اس اعتبار سے انگریز کے قانون اور ہمارے شرعی قانون میں کوئی فرق نہیں۔ اب فرض کرو کہ اگر انگریز مختلف جرائم کی وہی سزائیں اپنے ہاں رائج کر لیتا ہے جنہیں ہم شرعی حدود کہتے ہیں تو کیا سلیم! اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ انگریز کا نظامِ زندگی اسلامی ہو گیا؟ بالکل نہیں! تو اس سے اب ایک قدم آگے بڑھو۔ اگر ہم بھی اپنے ہاں جرائم کی وہی سزائیں تجویز کر لیں جنہیں شرعی تعزیرات کہتے ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آجائے گا کہ ہمارا نظامِ زندگی اسلامی ہو گیا! ہرگز نہیں۔ اس سے سلیم تم نے سمجھ لیا ہو گا کہ نظامِ اسلامی اور شے ہے اور قوانین شرعی اور شے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوانین شرعی، نظامِ اسلامی کا ایک جزو ہیں۔ اس وقت تک جس قدر مطالبات پیش ہو رہے ہیں وہ محض قوانین شرعی کی تنفیذ کے لئے ہو رہے ہیں۔ اگر ہماری حکومت ان شرعی قوانین کو اختیار کر لے تو ہمارے اربابِ شریعت مطمئن ہو جائیں گے کہ "حکومتِ خداوندی" کا قیام ہو گیا۔ لیکن ادھر سے ان قوانین کا نفاذ ہو گا اور اُدھر سے ان قانونی موشگافیوں کے ذریعہ ان قوانین کی گرفت سے بچنے کے حیلے وضع کئے جائیں گے۔ سلیم! تمہیں معلوم ہے کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں ایک باب، باب الحیل بھی ہوتا ہے۔ یعنی وہ حیلے جن سے مجرم قانونی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ تم حیران ہو گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں! لیکن سلیم! میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ یقین نہ آئے تو ان کتابوں کو اٹھا کر خود دیکھ لو اور پھر علامہ ابن قیم کی اعلام الموقعین دیکھو جس میں ان "شرعی حیلوں" کا رد کیا گیا ہے۔ تمہاری دلچسپی کے لئے ان حیل میں سے ایک حیلہ مثالاً لکھتا ہوں۔ اس سے تم سمجھ بھی جاؤ گے کہ "شرعی حیلوں" سے مفہوم کیا ہے۔ دو آدمیوں نے مل کر ایک مکان سے مال چرایا اور موقعہ پر گرفتار ہو گئے۔ عدالت میں پیش ہوئے۔ جرم ثابت تھا۔ شرعی تعزیر کی رو سے چور کا ہاتھ کاٹنا چاہیے۔ لیکن اب دیکھئے کہ یہ

کس طرح اس سزا سے بچتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ سرکار! میں نے صرف نقب لگائی ہے۔ نقب لگانا چوری نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے بیشک مال اکٹھا کیا اور وہاں سے لیکر چلا۔ لیکن منقوب دکان میں پڑا ہوا مال، مالِ محفوظ نہیں کہلا سکتا۔ اور چوری مالِ محفوظ کو لے جانے کا نام ہے۔ لہٰذا مجھ پر چوری کا جرم عائد نہیں ہوسکتا۔ لیجئے! دونوں چور، چوری کے جرم سے بری ہوگئے۔ دوسرے جرم ان پر لگاتے رہیئے۔ اس قسم کے حیلے، سلیم! روز عدالتوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ وکلاء کے معاش کا بیشتر حصہ اس قسم کی حیلہ تراشیاں ہیں۔ لہٰذا محض شرعی قوانین کے تنفیذ سے نفوس میں اصلاح نہیں ہوسکتی۔ قلوب میں انقلاب، اسلامی نظام کے قیام سے ہوگا۔ اسلامی نظام کیا ہے؟ اے سلیم! میں تمہیں اس خط میں نہیں سمجھا سکتا۔ اس کے لئے تمہیں معارف القرآن کی پانچویں جلد کا انتظار کرنا ہوگا یا اگر مجھے اللہ نے فرصت دی تو اس کی اشاعت سے قبل کہیں جداگانہ بھی لکھ دوں گا۔ لیکن وہ پھر بھی جامع اور مکمل نہیں ہوگا۔ اسلامی نظام، انسانی زندگی کو اس طرح محیط ہوتا ہے جس طرح فضا کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ہوا، انسانی جسم کو لپیٹے ہوتی ہے۔ اور بایں نمط کہ یہ کرۂ ہوائی اس کی زندگی کا مدار و اساس ہوتے ہوئے اس کی آزادیوں میں کہیں مخلِ انداز نہیں ہوتا۔ چلتے چلتے، چند الفاظ میں سلیم! یوں سمجھ لو کہ۔

(۱) کائنات ایک مقصد کے ماتحت پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں جاری ہے۔

(۲) اس سفر میں کائنات کی اس وقت تک کی تگ و تاز کا ماحصل انسان ہے۔

(۳) اب کائنات کو اس کی منزلِ مقصود تک انسان نے لے جانا ہے۔

(۴) انسان، اس منزل تک قرآنی نظامِ زندگی کے ماتحت ہی پہنچ سکتا ہے۔

(۵) اس نظام کی بنیاد توحید ہے۔ یعنی وحدتِ خالق، وحدتِ خلق، وحدتِ مقصد، تفصیل اس اجمال کی پورے کا پورا اسلامی نظام ہے۔ شرعی قوانین اس نظام کا ایک جزو ہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں سلیم! کہ آپ اس جزو کو اگر جاری کر سکتے ہیں تو اتنا بھی نہ کریں۔ مقصود پورے کے پورے اسلامی نظام کو جاری کرنا ہوگا۔ اس کی ابتدا قوانین سے کرو تاکہ معاشرہ کا نظام تو

سرکشی کے بجائے ضبط میں آجائے۔

چونکہ اس وقت بحث صرف یہ تھی کہ شرعی قوانین کی ترتیب و تدوین کس طرح عمل میں آئیگی۔ اس لئے میں نے اپنے مضمون "اسلامی نظام" میں صرف اسی نقطہ تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ اس مضمون کے عنوان سے، اس کو اسلامی نظام نہ سمجھ لینا۔ اس مضمون میں اسلامی نظام کے صرف ایک گوشہ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ چیز کہ یہ گوشہ (یعنی ضابطۂ قوانین) کس طرح پورے نظام کا جز دبن کر اس مقصد عظیم کے حصول میں ممد ہوتا ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک سلیم پورے کا پورا اسلامی نظام اور اس کا منتہی آپ کے سامنے نہ ہو۔ اس کے لئے سلیم!

کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اب سلیم تمہاری آخری بات کا جواب آتا ہے۔ یہ تمہیں تسلیم ہے کہ ایسے معاملات سامنے آسکتے ہیں جن کی جزئیات نہ قرآن نے متعین کی ہیں اور نہ وہ کہیں روایات میں ملتی ہیں۔ اب اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ جزئیات کی تعیین صرف رسول ہی کرسکتا ہے تو ان امور کی جزئیات کو کون متعین کرے گا؟ اس لئے کہ باب رسالت تو بند ہو چکا ہے۔ یہ تھی وہ الجھن جس کے لئے کہیں ہر صدی کے اخیر ایک مجدد کا عقیدہ وضع کرنا پڑا اور کہیں مہدی آخر الزمان کا انتظار اٹھانا پڑا۔ اسی سے مدعیان نبوت نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے رسالت کا دروازہ کھول دیا۔ اگر یہ سمجھ لیا جاتا کہ جزئیات کی تعیین امت کا فریضہ ہے تو پھر نہ کسی الگ مجدد کی ضرورت پڑتی نہ کسی جداگانہ مہدی کی۔ نہ یہ کرسیاں رکھی جاتیں نہ ان پر کوئی نبی بن کر بیٹھنے کی جرأت کرتا۔ تجدید و ہدایت کا سلسلہ مسلسل و متواتر قائم رہتا۔ لیکن مسلمانوں نے یہ نہ کیا اور جب اس غلط بینی سے پیچیدگیاں پیدا ہوئیں تو ان کے لیے ایسے حل تجویز کئے جس سے وہ خواب پریشان سے پریشان تر ہوتا چلا گیا۔ تم کہتے ہو کہ اس قسم کے امور کیلئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ یہی میں کہتا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ جو اجتہاد پہلے ہو چکا ہے اس میں مزید اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اجتہاد کے محتاج ہوتے ہی وہ امور ہیں جن میں مقتضیات زمانہ کی رو سے رد و بدل ہو سکتا ہو۔ جن امور کو اللہ تعالیٰ نے کھلا چھوڑ دیا ہے ان میں کسی ایک زمانہ کا اجتہاد ابدی فیصلہ نہیں بن سکتا۔ اگر اسے ابدی فیصلہ بن جانا ہوتا تو اس کا فیصلہ خود قرآن کر دیتا۔ اور اسے اجتہاد انسانی کے لئے آزاد نہ رکھتا۔ البتہ ہم اپنے زمانہ کے اجتہاد کے لئے ان تمام اجتہادات سے مستفید ہوں گے جو ہم سے پہلے کئے گئے ہیں۔ یہ ہے وہ طریق سلیم! جس سے ہم خدا کے ازلی اصولوں کی روشنی میں، کہ جو درحقیقت خود ہماری ہی فطرت کے ترجمان ہیں، ہر زمانہ کے مسائل کے نئے نئے حل دریافت کرتے چلے جائیں گے۔ یہ ہے دین مبین۔

لایزال و وارداتش نو بنو
برگ و بار محکماتش نو بنو
باطن او از تغیر بے غمے
ظاہر او انقلاب ہر دمے

والسلام

پرویز

جشنِ آزادی

دنیا کی ہر قوم نے فتح و کامرانی کی تقاریب پر، جشن مسرت منانے کے مختلف طرق و انداز وضع کئے ہیں۔ اس قسم کی تقاریب پر جشن کامرانی منانے کا ایک طریق مسلمانوں کو بھی سکھایا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ

جب اللہ کی تائید و نصرت سے تم پر کامرانی و شادکامی کی راہیں کھل جائیں

وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝

اور تو اس نظارہ کو اپنے سامنے جلوہ بار دیکھے کہ چاروں طرف سے لوگ فوج در فوج اور قطار در قطار، نظام خداوندی کے احاطۂ قدس میں داخل ہو رہے ہیں۔

تو اس وقت

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ

اپنے رب کی حمد و ستائش میں زمزمہ بار و نغمہ ریز ہو۔ اور اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کا محاسبہ کر کے، آیندہ کے لئے ان سے محفوظ رہنے کی التجا کر۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا

اگر تم نے ایسا کیا اور اپنی کمیوں کو پورا کرنے کا تہیہ کر لیا تو اللہ اپنی نصرت و تائید کے ساتھ پھر لوٹ آئے گا۔

عزمِ حرم

(جناب اسد ملتانی)

(چودھری خلیق الزماں کے اس مضمون کے بیانات پڑھ کر کہ ابھی پاکستان میں
آئینِ شریعت کے نفاذ کا وقت نہیں ہے :)

ذوقِ تمنا بڑھتے بڑھتے جذبۂ کامل تو ہو
پہلے مگر کوئی تمنّا کی طرف مائل تو ہو

اغیار سے یاری سہی، اتنی وداداری سہی
ذہنِ مسلماں ہیں مگر فرقِ حق و باطل تو ہو

پھر دیکھ لے عالم ذرا بیتابیٔ رفتار کا
حسنِ مآلِ کار کا دل سے کوئی قائل تو ہو

یہ بات بھی دشوار ہے، وہ بات بھی دشوار ہے
آسان ہو نے کیلئے آخر کوئی مشکل تو ہو

مانا کہ مدت چاہیئے قطعِ سفر کے واسطے
دل طالبِ محمل تو ہو، رُخ جانبِ منزل تو ہو

یوں ٹھوکریں کھاتے رہیں کب تک رہِ ترکستان میں
ہم قبلہ رو تو ہو چلیں کعبہ مرادِ دل تو ہو

آجائے گی منزل کی حد کٹ جائیگا صحرا اسد
عزمِ حرم سے کاروانِ شوق میں شامل تو ہو

مصرعِ ثانی

ہم ہنوز مرکزی حکومت پاکستان کے "طاؤس ورباب" (ماہنامہ ماہِ نو) کے تذکرہ رنگ و چنگ سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ حکومتِ مغربی پنجاب کا مصرع ثانی دادطلبی کے لئے سامنے آگیا۔ ماہِ نو ماہوار رسالہ تھا۔ لیکن حکومتِ پنجاب کا "استقلال" ہفتہ وار جریدہ ہے جس کے چند اشاعت ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ وہ حکومت پنجاب کہ جس کے سامنے علاوہ دیگر مہمات امور، مشرقی پنجاب کے لاکھوں مفلوک الحال متاع بردگان کی بحالی کا سوال ہی ایسا ہے جس کا احساسِ ذمہ داری اربابِ حل وعقد کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کردینے کے لئے کافی ہے۔ یہ جریدہ اسی حکومت کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس کا سرورق، کاغذ، طباعت وغیرہ مسرفانہ حد تک دیدہ زیب ہیں۔ مشمولات پر نگاہ ڈالئے تو بے ساختہ منہ سے نکلیگا کہ جریدہ کا کوئی مرکزی نقطہ یا مقصد نہیں بلکہ فی کل وادٍ یھیمون کی بین تفسیر ہے۔ اس میں ادب ہے، شاعری ہے، تاریخ ہے، معلومات ہیں۔ غرضیکہ بہت کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ تضیع اوقات اور حقائقِ زیست سے وقتی طور پر فرار کے لئے جریدہ ایک کامیاب امدادی حربہ ہے۔ یہ وہ عروسِ نو ہے جو شمعِ بزم تو بن سکتی ہے، چراغ خانہ نہیں بن سکتی۔

معاصر انقلاب کی اطلاع کے مطابق ہفتہ وار استقلال پر (اس کی آرائش، ادارہ کی تنخواہیں اور مضمون نگاروں کے معاوضے ملاکر) فی نسخہ تین روپے لاگت آتی ہے۔ لیکن اسے بازار میں فی نسخہ چار آنے کے حساب سے بیچا جارہا ہے۔ چار آنے میں سے بھی بیچنے والوں کی کمیشن نکال کر حکومت کو زیادہ سے زیادہ تین آنے فی نسخہ وصول ہوتے ہوں گے۔ اس حساب سے ایک نسخہ پر کوئی سوا گیارہ روپے ماہوار کا خسارہ ہے۔ اگر یہ رسالہ ایک ہزار بھی چھپتا ہو اور یہ فرض کرلیا جائے کہ ٹھیک ہزار کاپیاں فروخت ہو جاتی

ہیں تو ماہوار خسارہ سوا گیارہ ہزار روپئے بیٹھتا ہے حقیقی خسارہ اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالآخر مغربی پنجاب نے یہ سفید ہاتھی کیوں باندھ لیا ہے؟ اس کے بغیر کون سے کام بند تھے؟ ہم جون کی اشاعت میں مرکزی حکومت کی اس قسم کی کوشش بیہودہ یعنی ماہنامہ ماہ نو پر شدت سے تنقید کر چکے ہیں۔ مرکز کی دیکھا دیکھی اب مغربی پنجاب بھی ایک جریدہ لے کے بیٹھ گیا ہے یہ اقدامات افسوسناک ہی نہیں شرمناک بھی ہیں۔ کیا مرکزی اور صوبائی حکومتیں یہ سمجھتی ہیں کہ وہ سرکاری خزانوں کی بلا شرکت غیرے مالک ہیں؟ کیا ان کا ان خزانوں پر تصرف انھیں یہ حق بخشتا ہے کہ وہ شخصی اور استبدادی قوتوں کی طرح رعایا کا خون چوستے رہیں اور اس خون سے اس قسم کی ذہنی تفریحات کا سامان بہم پہنچاتے رہیں؟ جمہوری حکومت کے مدعی اور نمائندے ہونے کی حیثیت سے وہ قوم کے سامنے جواب دہ ہیں۔ قوم کا حق ہے کہ وہ اس اسراف کا جواز پوچھے اور عدم جواز کی صورت میں باز پرس کرے۔ یہ صحیح ہے کہ قوم میں وہ قوتِ محاسبہ مفقود ہے جس نے حضرت عمرؓ ایسے صاحب قوت و عظمت کا دامن کھینچ لیا تھا اور ان سے بر سر عام جواب طلب کر لیا گیا تھا کہ جو ایک چادر ان کے حصہ میں آئی ہے اس سے تو پورا کرتہ نہیں بن سکتا تھا پھر (حضرت) عمرؓ کا کرتہ کیسے پورا بن گیا ہے۔ حضرت عمرؓ جو اپنے آپ کو قوم کا حاکم نہیں، خادم سمجھتے تھے اس گستاخی سے برافروختہ نہیں ہوئے۔ وہ اس جرأت محاسبہ پر خوش ہوئے اور انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنے لڑکے کی چادر ملا کر اپنا پورا کرتہ بنوایا ہے۔ ہم دور عمرؓ سے زمان و مکان کے لحاظ سے ہزار فرسنگ دور ہیں۔ لیکن یہ دور آ کے رہے گا۔ حکومت کو جاننا چاہیے کہ روزوں کے لئے چٹائیاں اور لوٹے مہیا کر دینے سے اسلامی نظام رائج نہیں ہو جاتا، نہ محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کے قیام سے مطلوبہ فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ نظام اسلامی ایک ہمہ گیر فضا کا نام ہے۔ اس میں حکومت صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ انسان انسان پر حکمراں نہیں رہتا۔ اس قانون میں چند افراد منتخبہ کو کہ قوم انھیں مسانید حکومت پر فائز کرتی ہے، دیگر افراد ملت کے مقابلہ میں کوئی فائق و برتر حقوق نہیں مل جاتے۔ نہ وہ قوم کے حاکم بن جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر مفاد ملت ہوتا ہے اور ان کے لئے یہی امر وجہ احترام و تکریم ہوتا ہے کہ وہ مفاد ملت کے بہترین خدام و محافظ ہیں۔

محکمہ احیائے ملت اسلامیہ قائم کرکے مطمئن ہوجانے والی حکومت مغربی پنجاب سمجھتی ہے کہ باعتبار حکومت اسے افرادِ ملت پر برتری اور فوقیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے حکومتی ذرائع کو بے محابا استعمال کرکے انفرادی جدوجہد کو کچل کر رکھ دینا چاہتی ہے۔ غیر سرکاری جرائد و اخبارات کے لئے نیوز پرنٹ تک مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ ان مشکلات کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنہیں اس وادی میں حیران و سرگرداں ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بیٹھے بٹھائے حکومت کو ابال آتا ہے۔ ایک جریدہ جاری ہوجاتا ہے۔ اس کے لئے بہترین کاغذ سرکاری دفینوں سے نکل آتا ہے، اس پر بے تحاشہ پیسہ خرچ کیا جاتا ہے اور اصلی لاگت کے بارہویں حصہ قیمت پر اسے فروخت کیا جاتا ہے۔ حکومت انفرادی رسالوں کو سفید کاغذ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتی تو اپنے آپ کو اس پابندی سے کیوں مستثنیٰ سمجھتی ہے؟ کیا قانون محض رعایا کے لئے ہے اور اربابِ حکومت اس کی گرفت سے باہر ہیں؟

سیاسی اعتبار سے "استقلال" عبث ہے۔ کیونکہ نہ یہ کسی متعین مقصد کے پیش نظر نکالا گیا معلوم ہوتا ہے نہ یہ اس قسم کا کوئی مقصد ہی پورا کرسکتا ہے۔ قوم کے مسائل و مصائب لاینحل پڑے ہیں۔ قوم اور حکومت میں بُعد و مغائرت بدستور موجود ہے۔ حکومت کا جریدہ اس کام بھی نہ آسکے تو فائدہ؟

اقتصادی اعتبار سے یہ خطرناک اقدام ہے۔ اس کا تباہ کن اثر قوم کی قوت مقابلہ پر پڑیگا۔ کوئی غیر محدود ذرائع دولت کا مالک شخص ہی اس قسم کا اقدام کرکے مدمقابل بن سکتا ہے۔ صحیح اور جائز مقابلے کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ پوچھا جاسکتا ہے کہ حکومت تین روپے کی لاگت والی چیز کو چار بلکہ تین آنے میں کیوں فروخت کرتی ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اتنا کچھ اسراف کرنے کے بعد بھی یہ جریدہ اس قابل نہیں بنتا کہ یہ اپنا خرچ ہی نکال سکے؟ اگر ایسا ہے تو ایسے جریدہ کو زندہ رکھنا اقتصادی حماقت ہے۔ اگر ایسا نہیں تو حکومت کو چاہئے کہ وہ رسالہ کو حکومتی سرگرمیوں تک محدود رکھے، اس کو ظاہری طور پر آراستہ کرنے پر کم سے کم خرچ کرے اور حقائق و معلومات بہم پہنچائے۔ حقائق و معلومات ایسی مدات ہیں کہ یہ حکومت بطریق احسن پورا کرسکتی ہے۔ ایسا رسالہ مفت بھی تقسیم ہوسکتا ہے اور اس کی مناسب یا برائے نام قیمت بھی لی جاسکتی ہے۔ وہ چونکہ ایک خاص ضروری مقصد کے تحت نکالا گیا ہوگا اس لئے اس کے خرچ کا سوال

قابلِ اعتنا نہیں رہے گا۔ ہم نے مرکز کو بھی مشورہ دیا تھا اور مغربی پنجاب کو بھی مشورہ دیتے ہیں کہ شعر و ادب اس کے حکومتی دائرہ عمل سے خارج ہیں۔ اس کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے حکومتی دوائر کے ترجمان ہونے چاہئیں اور بس۔ حکومت اس ضمن میں اہم خدمت سرانجام دے سکتی ہے اور وہ خدمت پاکستان سے متعلق حقائق و معلومات کی نشر و اشاعت ہے۔ حکومت اور قوم سے متعلق معلوماتی مضامین اور ضروری دستاویزات شائع کئے جاسکتے ہیں۔ حکومت کو فی الفور ادھر توجہ دینی چاہیئے۔

ہم آخر میں ارکانِ مجلس دستورساز سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ کی جانب ضروری توجہ دیں اور آئندہ اجلاس میں حکومت سے اس اسراف کا جواب طلب کریں۔ جواب طلبی سے کہیں زیادہ ضرورت حکومت کا ہاتھ روکنے کی ہے اور اس کا مناسب تدارک کرنا چاہیئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت قوم کے بہترین سوچنے والے اور بہترین لکھنے والے حضرات کو ایک مرکزی ادارہ میں جمع کرے۔ وہ مل بیٹھکر ایک لائحہ عمل تجویز کریں اور تقسیمِ کار کی رو سے تحقیقات نشر و اشاعت کے فرائض کو صحیح ہاتھوں کے سپرد کریں۔ ان سب کے دوائرِ سعی و عمل الگ الگ ہوں لیکن رخ سب کا ایک ہی منزل کی طرف ہو اور وہ منزل اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ پاکستان کا استحکام بغرضِ قیامِ حکومتِ خداوندی ہو۔ ان کے سعی و عمل کے نتائج جرائد و رسائل اور تصنیفات و تالیفات کی شکل میں دنیا کے سامنے آئیں۔ اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے جسقدر روپیہ بھی صرف کیا جائے بجا اور برمحل ہوگا۔ اس سے قوم کے دل و دماغ کی تعمیر صحیح خطوط پر ہوگی اور ادبِ صالحہ کے "ذخائر" سے قوم کا سینہ مالامال ہوجائے گا۔

لیکن یہ تو وہ کرے جس کی نگاہوں کے سامنے کوئی منزل اور سینہ میں اس منزل کے حصول کی تڑپ ہو یہ ان کے بس کی بات نہیں جن کی ساری زندگی "طاؤس و رباب" کی چلتی پھرتی تصویر ہو۔

محشرستانِ پنجاب کا پس منظر

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ چلیپا را

(لیگ کے ایک سابق کارکن کے قلم سے)

جنوری ۱۹۴۷ء کے اواخر میں مسلمانانِ پنجاب کو پنجاب کی غیر جمہوری اور غیر ذمہ دار حکومت کے خلاف ایک جنگ لڑنا پڑی۔ اس جنگ کے لئے مسلمان قطعاً تیار نہیں تھے۔ وہ صوبائی خود مختاری کے نفاذ سے اپنی اکثریت کے صوبے میں پس رہے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات عمومی میں پنجاب کے پسے ہوئے مسلمانوں نے ایک غیر نمائندہ اور قاہر حکومت کے اقتدار کی موجودگی میں اپنی وحدت ملت کا ایک واضح ثبوت دیا۔ ۱۹۳۷ء میں جس اسمبلی کے لئے مسلم لیگ صرف دو ممبر منتخب کرا سکی تھی نو سال بعد اسی اسمبلی کی ۸۶ نشستوں میں سے اسی پر لیگ نے قبضہ کر لیا۔ مسلمانان پنجاب کے اس فیصلے کے بعد اس امر میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی کہ پنجاب کی اکثریت زیادہ دیر تک صوبے کے نظم ونسق سے بے دخل نہ رہ سکے گی۔ لیکن واقعات اس قسم کے ہو گئے کہ آئین وجمہوریت کے تقاضے بالائے طاق رکھ دیئے گئے۔ اس وقت تک کانگرس اور اکالی سکھوں کا اختلاف نازک صورت اختیار کر چکا تھا اور انتخابات کے نتائج تک، سکھ، مشترکہ مفادات کی بنا پر نہیں، تو کم از کم کانگرس کی مشترکہ مخالفت کی وجہ سے مسلمانوں کے زیادہ قریب ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ کے انتخابی جلسوں میں سکھ بڑے شوق سے جاتے تھے اور کانگرسی دسیسہ کاریوں پر تنقید سے وہ خوش ہوتے تھے۔ کئی بار اکالی سکھوں نے مسلم لیگ کو جلسوں کے لئے کرسیوں، دریوں اور دیگر سامان کی پیشکش کی۔ پولنگ کے دوران میں کئی پولنگ سٹیشنوں پر سکھوں نے اپنے کیمپ، پورے انتظامات سمیت، لیگ کے کارکنوں کے حوالے کر دیئے۔ سابق مرکزی اسمبلی کے

انتخابات میں کانگرس کے مقابلے میں اکالی امیدوار کی کامیابی کا جب اعلان ہوا، اسی کے ساتھ ہی رسوائے ہند حسین بھائی لال جی کے مقابلے میں قائدِاعظم کی کامیابی کی خبر ملی۔ ضلع راولپنڈی میں اکالی سکھوں نے لیگ سے مل کر مشترکہ طریق پر خوشی منائی اور قائدِاعظم کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھا۔

ان حالات کے پیشِ نظر عام یقین پایا جاتا تھا کہ پنجاب میں لیگ اکالی کولیشن ضرور قائم ہوجائیگی۔ عین اس وقت کانگرس کی طرف سے "مولانا" ابوالکلام آزاد مسلمانانِ پنجاب کو اپنے جائز حق سے محروم کرنے کے "مقدس" مشن کو لے کر لاہور پہنچے۔ لیگ نے پنجاب کی وزارت میں سکھوں کو پانچ نشستیں پیش کیں اور ہر قسم کی مراعات دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن "مولانا" نے سکھوں کو کچھ ایسے سبز باغ دکھائے کہ انھیں یک لخت پنجاب میں لیگ کے اقتدار میں پاکستان نظر آنے لگا اور انھوں نے غیر لیگی وزارت میں صرف ایک نشست لینے پر قناعت، اس اطمینان کے ساتھ کی کہ اس طرح پنجاب میں لیگ وزارت کے امکانات کم ہوسکیں گے۔ سکھوں نے اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچے بغیر لیگ کے مقابلے میں کانگرس سے "سمجھوتہ" کرلیا (زیادہ صحیح لفظوں میں انھوں نے کانگرس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے)۔ اس خلافِ لیگ محاذ کو زیادہ مضبوط کرنے کے لئے آزاد صاحب کو زیادہ دقت نہ ہوئی کیونکہ ان کی "نیک" مثال کی تقلید میں پنجاب میں بھی جاہ پرست مسلمانوں کا ایک گروہ موجود تھا جو اپنے دنیاوی مفاد کی خاطر ملت سے غداری کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا تھا۔ ان دھتکارے ہوئے نام نہاد مسلمانوں کے لیڈر ملک خضر حیات خاں کو خلافِ لیگ محاذ کا لیڈر بنا دیا گیا۔ ان سیاسی ریشہ دوانیوں اور سودا بازیوں کے پیچھے گورنر گلینسی کا "غیبی" ہاتھ کارفرما تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب کی حکومت اکثریت کے اسّی نمائندوں سے چھین کر چھ آدمیوں کے حوالے کردی گئی اور ایک برائے نام مسلمان وزیرِاعظم کے ماتحت پنجاب میں کانگرسی وزارت قائم ہوگئی۔

اس وزارت کی یک سالہ زندگی مسلمانوں کے لئے ایک دورِ ابتلا تھا۔ انتخابات میں فتح کی خوشی، یاس و حزن میں تبدیل ہوگئی۔ اس ایک سال کے عرصہ میں مسلمان، صوبے کی سیاسی، معاشی اور مجلسی

زندگی سے عملی طور پر بے دخل کر دیئے گئے لیکن انھوں نے یہ سب کچھ کمال صبر اور حوصلے سے گوارا کیا۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں، طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر حکومت پنجاب نے یک گونت اور بلا وجہ مسلم لیگ نیشنل گارڈز کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ مسلمان اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ اپنی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انھیں اپنی کمزوری اور دشمن کی طاقت کا اچھی طرح احساس تھا۔ مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ چند مستثنیات کے سوا، سیاسی اعتبار سے نو آموز تھے ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ امراء یا امراء زادے تھے۔ اور اگر یہ وصف ان میں نہ ہوتا تو ان کا صفِ اول میں آنا از قبیل محالات ہوتا۔ ان کی سابقہ زندگی امن و سکون اور تعیش کا مرقع تھی۔ ان ناساعد حالات میں پنجاب کے مسلمانوں نے حکومت کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور عام توقعات اور قیاسات کے خلاف، یہ جنگ اس عمدگی سے لڑی کہ دنیا ششدر رہ گئی۔ مسلم لیگ کے سر برآوردہ لیڈر سب سے پہلے گرفتاری کے لئے پیش ہوئے اور انھوں نے اپنے کردار سے مخالفین کے اس طعنے کو غلط ثابت کر دیا کہ وہ جیل نہیں جا سکتے۔ لیڈروں کے جیل چلے جانے کے بعد عوام نے خود اس تحریک کو چلایا۔ منظم، لیکن پر امن طریق پر، جلسے کئے، جلوس نکالے اور مظاہرے کئے۔ یہ تمام کارروائی جس ضبط و نظم اور صبر و تحمل سے کی گئی مخالفین بھی اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ اس وقت کی پنجاب کانگرس اسمبلی پارٹی کے چیف وہپ سیٹھ سدرشن نے ایک اخباری بیان میں مسلمانوں کی امن پسندی اور عالی ظرفی کی تعریف کی۔ شہری مسلمانوں کے علاوہ دیہاتیوں نے جس ذوق و شوق اور گرم جوشی سے اس تحریک میں حصہ لیا اس کے متعلق انگریزی اخبار سٹیٹسمین نے لکھا تھا کہ کانگرس کی کسی تحریک میں دیہاتی عوام نے اس قدر دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس اخبار نے مسلمانوں کے اس جذبے کی داد دی جس کے ماتحت انھوں نے اپنی تحریک کو امن شکنی یا فرقہ وار رنگ دینے سے بچائے رکھا۔ پنجاب کے قریب ہر چھوٹے بڑے شہر اور قصبے میں ہر روز ہزاروں اور لاکھوں کے اجتماعات ہوتے تھے لیکن ۳۴ دنوں میں ایک مثال بھی ایسی نہ ملی کہ کسی جگہ کسی غیر مسلم کے خلاف کوئی دل آزار نعرہ لگایا گیا ہو یا کوئی امن سوز حرکت کی گئی ہو۔

گجرات شہر میں ایک روز جلوس کے دوران میں ایک دو غیر ذمہ دار مسلمان نوجوانوں نے ایک ہندو حلوائی کی دکان لوٹ لی۔ گجرات مسلم لیگ کے ایک ذمہ دار کارکن نے نقصان کی تفصیل طلب کرکے اس حلوائی کو رقم ادا کر دی۔ مسلمانوں کی امن دوستی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ امن دوستی کی انتہا یہ ہے کہ لاہور میں دو لاکھ کے جلوس میں کسی شرپسند کی اینٹ سے ایک مسلمان نوجوان شہید ہو گیا۔ مسلمان مشتعل ہوئے اور اگر وہ چاہتے تو شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے تھے لیکن انھوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور پورے سکون کے ساتھ جلوس جاری رکھا۔ حکومت کی طرف سے حد درجہ کا تشدد روا رکھا گیا۔ معزز مسلمان خواتین پر وحشیانہ لاٹھی چارج کئے گئے اور اشک آور گیس کے اندھا دھند استعمال سے انہیں بیہوش کر دیا گیا لیکن مسلمان اشتعال میں نہ آئے مسلمانوں نے عدیم النظیر صبر و استقلال سے حکومت کا مقابلہ کیا اور آخر حکومت کو مجبوراً رائے عامہ کی طاقت کے مقابلہ میں شکست تسلیم کرنا پڑی اور اس نے وہ تمام ناجائز پابندیاں ہٹا دیں جو شہری آزادی پر لگائی گئی تھیں۔ نیشنل گارڈز پر پابندیاں لگانے کے علاوہ حکومت نے صوبہ بھر میں دفعہ ۱۴۴ اور پنجاب پبلک سیفٹی آرڈیننس کا نفاذ کر دیا تھا مسلمانوں نے ۳۴ روز کی جنگ میں ان پابندیوں کو عملی طور پر ناکارہ کر کے رکھ دیا اور دنیا پر یہ بھی ثابت کر دیا کہ جلسوں اور جلوسوں سے صوبے کے امن کو کوئی خطرہ نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ حکومت نے واقعات کی منطق کے سامنے سر جھکاتے ہوئے ان تمام بے معنی پابندیوں کو اٹھا دیا۔ ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو جب صوبہ مسلم لیگ کی ہدایات کے مطابق مسلمانانِ پنجاب نے کامیابی پر جشنِ فتح منایا تو ان کے قلوب مطمئن تھے کہ انھوں نے تحریر و تقریر اور اجتماع کی پابندیاں منسوخ کرا کر نہ صرف اپنی بلکہ ہر پنجابی کی شہری آزادی بحال کرا دی ہے کیونکہ یہ پابندیاں ہر شریف اور امن پسند پنجابی کے شہری حقوق پر ایک ناجائز چھاپہ تھیں۔

۲ اور ۳ مارچ کی درمیانی شب کو لیگی وزارت نے استعفیٰ دیدیا۔ وزارت کا استعفیٰ اس قدر غیر متوقع تھا کہ ۳ مارچ کی صبح کو جب آل انڈیا ریڈیو پر اس کی خبر نشر ہوئی تو سننے والوں کا فوری ردِ عمل یہ تھا کہ ــــ ایں چہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب ــــ اور حقیقت تو یہ ہے کہ پنجاب مسلم لیگ کے ممتاز راہنماؤں کو بھی حالات کی اس غیر متوقع تبدیلی کا کچھ علم نہ تھا۔ غرض وزرائے پنجاب کے سوا ہر شخص کے لئے یہ خبر تحیر زا تھی اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کا تحیر

مسرت آمیز تھا۔ اسی روز گورنر پنجاب نے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد افتخار حسین خاں ممدوٹ کو تشکیل وزارت کی دعوت دی۔ انھوں نے اس دعوت کو منظور کر لیا۔ مسلمانانِ پنجاب نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں اور ان کے مصائب و آلام کا صبر آزما دور بالآخر ختم ہونے والا ہے۔

دس سال کے بعد حق دار کو اس کا حق مل جانے پر اغیار کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مسلم لیگ کی "غیر آئینی" حرکات پر طنز کرنے والوں نے آئین سازی کے مرکز —— اسمبلی —— میں بیٹھ کر آئین و قانون کا صریح استخفاف کیا بلکہ تہذیب و شرافت کے ابتدائی اصولوں کو بھی گلدستۂ طاق نسیاں بنا دیا گیا۔ ماسٹر تارا سنگھ اسمبلی کے ایوان سے ننگی کرپان چمکاتے ہوئے نکلے اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ طریقے سے "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگائے۔ ماسٹر صاحب صرف چند روز پیشتر ہی امریکی نمائندگان جرائد کی وساطت سے دنیا بھر میں اپنے یہ عزائم نشر کرا چکے تھے کہ نہ صرف مشرقی پنجاب بلکہ مغربی پنجاب سے بھی وہ مسلمانوں کو نکال دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے اپنی ان تیاریوں کی تشہیر کی جو سکھوں نے ۱۹۴۶ء میں پنجاب کو "فتح" کرنے کی غرض سے مکمل کی تھیں۔ اُس وقت ماسٹر صاحب سکھوں کے ایک مسلمہ لیڈر تھے۔ سکھ ان کے ایک ایک لفظ کو اپنے لئے حکم کا درجہ دیتے تھے۔ اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ اور غیر محتاط اعلانات کرتے وقت انھیں بخوبی علم تھا کہ وہ سکھوں کو آگ اور خون کی راہ پر ڈال رہے ہیں۔ ممتاز ہندو اور سکھ راہنماؤں کی اشتعال انگیزی اور آتش انگیزی کا اندازہ کرنے کے لئے ان کی پبلک تقاریر و بیانات کو دہرانا ضروری ہے۔

ماسٹر تارا سنگھ

۲۸ فروری ۱۹۴۷ء

میں سمجھ نہیں سکتا کہ ہم خانہ جنگی کو کیسے روک سکتے ہیں۔ جب تک مسلمان پنجاب پر راج کرنے کی خواہش ترک نہیں کر دیں گے اُس وقت تک ان سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکے گا۔ سکھوں کے پاس اس قدر طاقت موجود ہے کہ وہ مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے نکال دیں

لیکن ہم اسی پر اکتفا کیوں کریں؟ ہم ان کو سارے پنجاب سے نکال دیں گے۔ مسلم لیگ نے پنجاب کی مخلوط وزارت کے خلاف ایک ماہ تک جو ایجی ٹیشن کی ہے اس کے جواب میں سکھوں نے اپنی نجی رضاکار فوج کی از سر نو تنظیم شروع کر دی ہے کیونکہ اس مخلوط وزارت میں سکھوں کا نمائندہ بھی موجود ہے۔

۳ر مارچ ۱۹۴۷ء

خالصہ پنتھ کو چاہیئے کہ وہ اب موقع کی نزاکت کو سمجھے۔ میں ہر سکھ سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنا فرض ادا کرے۔ ہم زندہ رہیں گے یا مر جائیں گے لیکن مسلمان راج کی اطاعت تسلیم نہیں کریں گے۔ خالصہ! اٹھو اور اپنے لنگر لنگوٹ کس لو! نازک گھڑی آپہنچی ہے۔ واہگورو ہماری راہنمائی اور مدد کرے!

۴ر مارچ ۱۹۴۷ء

۴ر مارچ کو ماسٹر تارا سنگھ اسمبلی ہال سے "پاکستان مردہ باد" اور "ست سری اکال" کے نعرے لگاتے اور اپنی کرپان لہراتے ہوئے نکلے۔ انھوں نے کہا:

وقت آگیا ہے کہ صرف تلوار کی طاقت کا راج ہوگا۔ سکھ تیار ہیں۔ ہم مسلمانوں کے ہوش ٹھکانے لے آئیں گے۔

اسی روز ایک اور تقریر میں انھوں نے کہا:

اے ہندوؤ اور سکھو! تمہاری آزمائش سر پر ہے۔ جاپانیوں اور نازیوں کی طرح اپنے آپ کو خود فنا کر دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ مادر وطن ہم سے خون طلب کر رہی ہے اور ہم اپنی اپنی ماں کی پیاس خون سے بجھائیں گے۔ ہم نے مغلستان کا خاتمہ کر دیا، ہم پاکستان کو بھی تباہ کر دیں گے۔ میں کئی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں کہ صوبے میں فتنہ پرور ش پا رہا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اکالی فوج کی پھر سے تنظیم شروع کر دی ہے۔ اگر ہم انگریزوں سے حکومت چھین سکتے ہیں تو مسلمانوں سے حکومت چھیننے میں کوئی ہمارا مزاحم نہیں ہو سکتا۔

مسلم لیگ کی ٹانگیں اور اعضاء ہماری گرفت میں ہیں اور ہم انھیں توڑ کر رکھ دیں گے۔ اس جلسہ سے جب جاؤ تو دل میں یہ عہد کر کے جاؤ کہ ہم لیگ کو زندہ رہنے نہیں دیں گے۔ دنیا میں ہمیشہ اقلیتوں نے حکومت کی ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں سے سلطنت چھینی اور مسلمانوں سے سکھوں نے چھین لی۔ سکھوں نے مسلمانوں پر اپنے زورِ بازو سے حکومت کی اور اب بھی سکھ مسلمانوں پر حکومت کریں گے۔ ہم ان پر حکومت کریں گے اور یہ حکومت ہم لڑ کر حاصل کریں گے۔ میں نے بگل بجا دیا ہے۔ مسلم لیگ کو فنا کر دو۔

ایک اور تقریر میں ماسٹر تارا سنگھ نے کہا:

جب تک ہم پنجاب سے مسلم راج کا خاتمہ نہیں کر دیں گے ہماری تلوار نیام میں نہیں جائیگی اور جب ہم نے دیکھا کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو رہے تو یہی تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ کر اپنا خاتمہ کر دیں گے۔

گیانی کرتار سنگھ

۴ر مارچ ۱۹۴۷ء

آج کے دن سے ہماری مقدس جنگ شروع ہو گئی ہے۔ آج سے ایک سو سال پیشتر ہمارے زرد جھنڈے لاہور کے قلعے پر لہرا رہے تھے۔ یہی جھنڈا پھر لہرائے گا۔ یہ فیصلہ ہمارا جنگ کا کلہاڑا کرے گا کہ حکومت مسلمان کریں گے یا ہم۔ سکھ گورو گوبند سنگھ کے نام پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔

چودہری لہری سنگھ (وزیر بلدیات پنجاب)

۴ر مارچ ۱۹۴۷ء

میں جاٹ ہوں اور جاٹ زیادہ باتیں نہیں کیا کرتے۔ جاٹوں نے سکھ مذہب اس لئے قبول کیا تھا کہ مسلم راج کا خاتمہ کیا جا سکے۔ یہی جاٹ ایک دفعہ پھر لڑ کر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔

پنجاب کے وزیر خزانہ لالہ بھیم سین سچر نے جن پر حکومت کا ایک اہم رکن ہونے کی حیثیت سے صوبے کے امن امان کے تحفظ کی اہم ذمہ داری عائد ہوتی تھی، خود ایک خلافِ قانون جلوس کی قیادت کرتے ہوئے نکلے اور اشتعال انگیزی میں دوسرے راہنماؤں سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر گوپی چند

۴ر مارچ ۱۹۴۷ء

ان دنوں میں ایسے مظاہرے کرو کہ ہم میں سے جو لوگ غدار ہیں وہ مسلم لیگ سے کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کر سکیں۔

چودھری کرشن گوپال دت

۴ر مارچ ۱۹۴۷ء

کیا کوئی ایسا آدمی ہے جو ہم کو اپنی ماں سے چھین کر ممدوٹ کی گود میں ڈال دے؟ ایسی فضا پیدا کر دو کہ لیگ کے لئے وزارت بنانا ناممکن ہو جائے۔

ہندو اخبارات

۵ر مارچ ۱۹۴۷ء

لیگ وزارت کو زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن طریق کے استعمال سے اس قسم کی وزارت کا چلنا محال کر دیں۔ ہم ہر شخص اور ہر طاقت کو — خواہ وہ گورنر کی ہو یا کسی اور کی — خبردار کر دینا چاہتے ہیں کہ ان کے ناپاک عزائم ہندوؤں، سکھوں اور اچھوتوں کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے۔

ملاپ، ویر بھارت، پرتاپ، پربھات، اجیت، بندے ماترم، جے ہند، ہندی ملاپ۔

ان لیڈروں کے علاوہ کانگریس اور سکھوں کے ہر قابلِ ذکر لیڈر نے ہڑبونگ اور دیوانہ پن کا بے مثل مظاہرہ کیا اور اپنی تقریروں اور دوسری حرکتوں سے ہندوؤں اور سکھوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کا زہر بھر دیا۔ جس قوم کے ذمہ دار لیڈر نتائج و عواقب کو سوچنے کی توفیق سے عاری

ہو چکے ہوں اُس کے عوام سے اتنی بڑی صلاحیت کی توقع عبث ہے۔ ہندو اور سکھ لیڈر اپنی قوموں کو آمادۂ فساد کرنے اور مسلم دشمنی کا اشتعالی جذبہ تیز تر کرنے کے درپے تھے اور مسلمان لیڈر اپنی قوم کو صبر و تحمل کی تلقین کر رہے تھے۔ انھوں نے خدا اور رسول کا واسطہ دے کر مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اشتعال میں نہ آئیں اور ہر حالت میں امن قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ ان حضرات کی تقاریر اور اخباری بیانات اب بھی موجود ہیں جو مسلمانوں کی عالی ظرفی اور قوتِ برداشت کا زندہ ثبوت ہیں۔ ان میں نہ تلواروں کی نمائش ہے نہ گیدڑ بھبکیاں ہیں اور نہ تعلیاں۔ مسلم اخبارات نے اپنے ہندو معاصرین کے برعکس چوکھٹے بنا بنا کر مسلمانوں کو صبر و ضبط کی ہدایت کی۔ تصویر کا یہ رخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

افتخار حسین خاں ممدوٹ

۳ مارچ ۱۹۴۷ء

میں مسلمانانِ پنجاب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ پُرامن و پُرسکون رہیں۔ وہ کوئی جوابی مظاہرہ یا جلسہ نہ کریں۔ وہ نہ تو خود اشتعال میں آئیں اور نہ دوسری قوموں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائیں مجھے یقین ہے کہ مسلمان اپنے جذبات کو بے قابو نہیں ہونے دینگے اور کامل ضبط و نظم رکھیں گے۔

۴ مارچ ۱۹۴۷ء

مجھے کامل توقع ہے کہ صوبے کے نظم و نسق میں اقلیتوں اور اکثریت کے نمائندوں میں مناسب اشتراکِ عمل اور وزیر اعظم برطانیہ کے تازہ اعلان سے پیدا شدہ آئینی مسائل کو حل کرنے کی راہ ہموار ہو چکی ہے۔ میں ہندوؤں، سکھوں اور دوسری اقلیتوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلم لیگ غیر مسلموں پر فرقہ دارانہ تغلب ٹھونسنا نہیں چاہتی۔ ہم ایک آسودہ اور خوشحال پنجاب کی تعمیر کے لئے ہر ایک کا رضاکارانہ تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

۶ مارچ ۱۹۴۷ء

سربراہ حکومت کی فوری علیحدگی سے لاہور اور پنجاب کے بعض دوسرے مقامات میں فرقہ دارانہ فساد، قتل و خون ریزی، آتش زنی اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اگرچہ گورنمنٹ

آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۹۳ کے ماتحت فی الحال انتظام کی تمام تر ذمہ داری گورنر کے سر ہے لیکن مختلف قوموں اور جماعتوں کے راہنماؤں کو اپنی اس ذمہ داری کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو عوام کی طرف سے اُن پر عائد ہوتی ہے۔ یہ عوام فرقہ دارانہ جنون کے اس مظاہرے سے گوناگوں مصائب کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ اس ہولناک صورتِ حالات کو ختم کرنے کے لئے متفقہ کوشش کرے۔ اس لئے میں ہندو اور سکھ راہنماؤں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ آگے بڑھیں تاکہ صوبے میں امن و امان کی بحالی کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ مجالسِ امن کی تشکیل کریں۔

غضنفر علی خاں

۷ر مارچ ۱۹۴۷ء

سیاسی مسائل کو تلوار یا پستول کی مدد سے طے کرنا بہت نامعقول بات ہے۔ غلط خطوط پر ایجی ٹیشن شروع کر دینے کی بجائے اکثریت اور اقلیت کو چاہئے کہ وہ ایک باعزت سمجھوتے کے ذریعے صوبے کے نظم و نسق میں حصہ لیں۔

۱۲ر مارچ ۱۹۴۷ء۔ مجوزہ "اینٹی پاکستان ڈے" کے متعلق غضنفر علی خاں نے کہا۔

میں اقلیتوں کو سیاسی مسائل کے متعلق اپنی رائے کے اظہار کے حق سے محروم نہیں کرنا چاہتا لیکن میں ہندوؤں اور سکھوں سے توقع کرتا ہوں کہ وہ یہ دن غیر متشددانہ طریق سے منائیں گے اور پنجاب کی صورتِ حالات کے پیش نظر اشتعال انگیز نعرے لگانے سے اجتناب کریں گے۔ مسلمانوں کو میری یہ نصیحت ہے کہ وہ بالکل مشتعل نہ ہوں۔

فیروز خاں نون

۱۲ر مارچ ۱۹۴۷ء

اب وہ وقت یقینی طور پر آگیا ہے کہ سکھ اور مسلمان سر جوڑ کر بیٹھیں اور حل دریافت کرنے کے لئے اپنے سیاسی مسائل کا جائزہ لیں۔ مجھے یقین ہے کہ پنجاب کے ہندو سیاسی فضا

کی اس خوشگوار تبدیلی کا خیر مقدم کریں گے۔ . . . اگر سکھوں کی اکثریت کی طرف سے پنجاب کی تقسیم کے متعلق پر زور اور آزاد مطالبہ پیش ہو تو مسلمان اسے رد نہیں کریں گے۔

صوبائی مجلس عمل

۱۰ / مارچ ۱۹۴۷ء

مسلم لیگ کی پوزیشن اب بھی وہی ہے جو ہمیشہ رہی ہے۔ ہم امن دوستی اور فرقہ دارانہ اتحاد چاہتے ہیں۔ ہم سب کو اپنا تعاون پیش کرتے ہیں اور صوبے میں امن اور دوستی کی بحالی کے لئے سب سے امداد چاہتے ہیں۔ ہم ہندو اور سکھ راہنماؤں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ایک گول میز کانفرنس کی صورت میں بیٹھیں اور ان مسائل کا حل سوچیں جو ہمیں باہمی طور پر طے کرنے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ خونریزی اور خانہ جنگی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا . . . . . ہم موجودہ بدامنی کو روکنے کے لئے حکومت کو اپنی دلی امداد کی پیشکش کرتے ہیں۔ ہم اس پر تیار ہیں کہ تمام جماعتیں باہم مل کر امن و آشتی اور دوستی کی فضا میں اپنے مسائل کو طے کرنے کی کوشش کریں۔

مسلم اخبارات

۱۱ / مارچ ۱۹۴۷ء

ہم مسلمانانِ پنجاب سے بالعموم اور مسلمانانِ لاہور سے بالخصوص مودبانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ کامل امن رکھیں اور ہر قسم کے اشتعال کے باوجود فرقہ وار جھگڑوں سے اجتناب کریں فرقہ دارانہ فساد کی ہر کوشش کی مزاحمت کی جائے اور اسے کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔

پاکستان ٹائمز، ایسٹرن ٹائمز، زمیندار، احسان، نوائے وقت۔

مسلمانوں کی مساعی امن ناکام رہیں۔ ہندو اور سکھ راہنماؤں کی شعلہ فشانیاں متاعِ امن کو برباد کرکے رہیں۔ ان راہنماؤں کی تقریروں سے متاثر ہو کر ہندوؤں اور سکھوں نے لاہور میں جلوس نکالے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انتہائی دلآزار نعرے لگائے۔ اس فتنہ انگیزی سے

لاہور میں، اور بعد میں امرتسر میں، فساد کی آگ بھڑک اٹھی جس نے بڑھتے بڑھتے سارے صوبے کو جہنم زار بنا دیا۔

یہ ہے پس منظر فضا کے اس تکدر کا جس کے ہولناک اثرات سے پنجاب کا کوئی گوشہ محفوظ نہیں رہا۔ مسلمانوں کے خلاف جو مشترکہ محاذ بنایا گیا تھا اس کے پروگرام میں پہلی شق "اینٹی پاکستان ڈے" تھا جو ۱۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو منایا جانا تھا۔ لیکن لاہور میں لیڈروں کی عام تقریر کے ساتھ ہی پنجاب بھر میں سکھوں نے امن سوز حرکات شروع کر دیں۔ (ہندو اس مرحلے پر صف اول سے ہٹ کر صف آخر میں چلے گئے تھے۔) مضمون کے اس حصے میں میں صرف ان واقعات کا تذکرہ کروں گا جو مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کے بعد ضلع راولپنڈی میں رونما ہوئے۔

لاہور کی اطلاعات ملنے پر سکھوں نے شہروں کے علاوہ قصبات اور دیہات میں نقل و حرکت شروع کر دی جو ان کے خطرناک عزائم کی غمازی کر رہی تھی۔ ضلع راولپنڈی کے دیہات دور دور پھیلے ہوئے ہیں۔ بیشتر علاقہ سطح مرتفع ہے۔ ذرائع آمد و رفت آسان نہیں۔ چند ایک جگہوں کے سوا کہیں بھی لاری وغیرہ کا انتظام نہیں۔ بہت سا علاقہ اتنا دشوار گذار ہے کہ اسے پیدل طے کرنا بھی خطرے کو مول لینا ہے۔ مسلمان فوجی ملازموں کے علاوہ زراعت پیشہ یا مزدوری پیشہ ہیں۔ لہذا انھیں بہت کم باہر جاتے یا شہروں سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ بیرونی حالات سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ یہ بھی ہے کہ وہ تعلیم میں پسماندہ ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہندو اور سکھ سارے تجارت پیشہ تھے اور اس مقصد کے لئے انھیں باہر کے علاقوں سے روابط رکھنے پڑتے تھے۔ گاؤں میں کپڑا، تیل، چینی اور اناج کی تقسیم کلی طور پر انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ تعلیم میں بھی وہ بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ اس چیز سے ہو سکتا ہے کہ آبادی کے موجودہ وسیع تبادلے سے بیشتر ضلع راولپنڈی میں جہاں مسلمانوں کی آبادی نوے فی صدی کے لگ بھگ تھی، مسلمانوں کے صرف دو ہائی سکول تھے۔ اس کے مقابلے میں سکھوں کے چھ اور ہندوؤں کے چار ہائی سکول اعلیٰ پیمانے پر چل رہے تھے۔ یہ سکول،

اُن ہائی اور اینگلو ورنیکلر مڈل سکولوں کے علاوہ تھے جو ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے ہندوؤں اور سکھوں کے مرکزوں میں کھولے گئے تھے۔ یہ لوگ سیاسی لحاظ سے بھی بہت ترقی یافتہ تھے۔ مسلمان باہر کی تبدیلیوں سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں اور ان کی جو تھوڑی بہت سیاسی معلومات ہوتی تھیں ان کا منبع بھی ہندو اور سکھ اور غیر مسلم اخبارات ہی ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی ان سیاسی معلومات کی نوعیت کا اندازہ ذیل کی ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔

گذشتہ انتخابات عمومی کے سلسلے میں راقم الحروف کو چند دیہات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ دیہاتیوں کی عام گفتگو کا موضوع فصلوں، بیلوں اور کبڈی وغیرہ کے علاوہ راشن اور کنٹرول کی دقتیں ہوتا ہے۔ وہ ہر پڑھے لکھے آدمی یا شہر کے باشندے سے ایک ہی سوال کرتے ہیں کہ کپڑا کب کھلے گا یا چینی کب کھلے گی؟ چند ایک دیہاتیوں نے بڑی معصومیت سے بیان کیا کہ سنا ہے کوئی شخص جنا (جناح) ہے جو کپڑا اور چینی کھولنے نہیں دیتا ورنہ مہاتما گاندھی تو بڑی کوشش کر رہے ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ کہاں سے سُنا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ لالہ فلاں صاحب کے پاس شہر سے ہر روز اخبار "چھپ" کر آتا ہے، اس میں لکھا ہے۔ (دیہاتیوں کے نفسیات کا یہ دلچسپ پہلو ہے کہ وہ ٹائپ شدہ یا چھپی ہوئی چیز پر بہت جلد یقین کر لیتے ہیں۔) اس ایک مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گاؤں کے بنئے کس طرح سادہ لوح دیہاتیوں کو بے وقوف بناتے اور اپنی ذخیرہ اندوزی، نفع بازی اور چور بازاری کو کیسے ستھرے طریقے سے چھپاتے رہے ہیں۔

ان واقعات کے ذکر سے مقصود اس الزام کی تردید ہے کہ مسلمانوں نے ایک طے شدہ سکیم کے مطابق فسادات کا آغاز کیا۔ شہروں کے مسلمانوں کی تیاریاں اس وقت بھی صفر کے برابر تھیں جب کہ سکھوں نے اپنی کرپانوں کی عام نمائش شروع کر دی تھی۔ مسلمانوں کو آخر وقت تک علم نہ تھا کہ حالات کیا صورت اختیار کرنے والے ہیں۔ دیہات کے جاہل اور کالانعام مسلمانوں کو پتہ ہی نہیں تھا کہ باہر کی دنیا میں ہو کیا رہا ہے۔ انھوں نے مقامی سکھوں کی نقل و حرکت اور کھلی تیاریوں سے اتنا معلوم کیا کہ باہر "کچھ" ہو رہا ہے یا "کچھ" ہونے والا ہے۔ اس سے وہ کسی قدر چوکنے ضرور ہو گئے لیکن شہر کے مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی

ربط نہیں تھا۔ انھیں باہر کی خبریں اگر کچھ پہنچیں تو ان کا ذریعہ خود ہندو اور سکھ تھے۔

۵ مارچ کو راولپنڈی شہر میں سکھوں نے ایک جلوس نکالا جس نے "پاکستان مردہ باد" "مسلم لیگ مردہ باد" "اسلام مردہ باد" "لال ٹوپی مردہ باد" وغیرہ کے نعرے لگائے۔ جلوس میں شامل ہونے والوں کے تیور ظاہر کر رہے تھے کہ ان کی نیت میں فتور ہے اور وہ آمادۂ فساد ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے ہوٹلوں اور جامع مسجد کے سامنے عمداً مظاہرے کئے اور مسلمانوں کو چھیڑنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن مسلمانوں نے غیر معمولی تحمل کا ثبوت دیا اور اپنے ممتاز لیڈروں کی ہدایت کے مطابق پوری طرح پرامن رہے۔ وہ سکھوں کی امن سوز حرکات پر مضطرب ضرور تھے لیکن محض اندیشۂ شر کے خیال سے انھوں نے اپنا غیظ و غضب قابو میں رکھا۔ سکھوں نے مسلمانوں کی اس مصلحت آمیز شرافت اور خاموشی کو ان کی کمزوری پر محمول کیا۔ ان کے حوصلے بڑھتے گئے تا آنکہ شام کو راولپنڈی کے مسلم لیگی ایم ایل اے چودھری ظفرالحق کے بھتیجے کی کار کو روک لیا۔ کار پر ہلالی پرچم لہرا رہا تھا، اسے اتار کر پھاڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی چودھری صاحب کے بھتیجے کو چاقوؤں سے زخمی کر دیا گیا۔ اندیشہ تھا کہ یہ واقعہ راولپنڈی کو فساد کی آگ میں جھونک دینے کے لئے کافی ہو گا۔ لیکن مسلمانوں نے اس موقع پر بھی اپنی روایتی فراخدلی اور امن دوستی کا ثبوت دیا اور اس صریح دراندستی پر بھی انھوں نے اپنے جوش و غضب کو بے قابو نہ ہونے دیا۔

اسی روز ضلع راولپنڈی کے ایک اور شہر گوجر خاں میں بھی سکھ طالب علموں نے ایک جلوس نکالا اور "پاکستان مردہ باد" وغیرہ کے نعرے لگائے۔ یہاں پر بھی مسلمانوں نے کامل ضبط و تحمل کا ثبوت دیا حالانکہ اس دوران میں باہر سے سکھوں کے مسلح دستے شہر میں پہنچنا شروع ہو گئے تھے جنھوں نے شہر کے گوردواروں اور دوسرے مرکزوں پر اپنے مورچے سنبھال لئے تھے۔ راولپنڈی میں بھی باہر سے سکھ کثیر تعداد میں داخل ہو رہے تھے۔ اس تمام عرصے میں حکومت کی انتظامی مشین، جس کی عقابی نگاہ مجرم کے دل کی تہوں میں چھپے ہوئے ارادوں کو بھی بھانپ لیتی ہے، بالکل معطل تھی۔ راولپنڈی کے مسلم لیگ لیڈروں نے نقضِ امن کے احتمالات کو کم کرنے کے لئے حکام کو بیدار کرنے اور انھیں اپنا فرض یاد دلانے

کی سہم کوششیں کیں لیکن حکام نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ پورے اطمینان کے ساتھ سارے تماشے کو دیکھ رہے تھے۔

۶ مارچ کو ہولی تھی۔ راولپنڈی میں اس روز دو بجے کمپنی باغ میں ایک جلسے کا انتظام کیا گیا۔ تانگے میں لاؤڈ سپیکر لگا کر شہر بھر میں اس جلسے کی منادی کی گئی۔ منادی کرنے کے حق پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا لیکن جس انداز سے اور جن الفاظ میں یہ منادی کی گئی ان میں ہر امن دوست شہری کے لئے دلچسپی کا کافی سامان موجود ہے۔ منادی نے اعلان کیا کہ ہندوؤں اور سکھوں کے آپس میں بہت اختلافات ہیں لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے مقابلہ میں ہم ایک ہیں۔ جلسے کے متعلق اطلاع ان الفاظ میں دی گئی۔

> آپ عرصہ سے ہولی مناتے رہے ہیں لیکن آج دو بجے کمپنی باغ میں خاص قسم کی ہولی منائی جائے گی۔ اس وقت تک ہم رنگ سے ہولی کھیلا کرتے تھے۔ لیکن آج ہم خون سے ہولی کھیلیں گے۔

ممکن ہے مہذب دنیا کے شریف باشندے ان الفاظ کی صحت میں شک کریں کیونکہ ایسی مہذب اور باوقار حکومت کی موجودگی میں، جس کے پاس ضابطہ فوجداری کی ضخیم کتاب موجود ہو اور جو مجرم کو سزا دینے کے پورے اختیارات بھی رکھتی ہو، اس قسم کا شبہ بھی حد درجہ کی جسارت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ محض "مشتے نمونہ از خروارے" ہیں اور راولپنڈی کا بچہ بچہ ان کی صحت کی تصدیق کرے گا۔ یہ الفاظ جو لاؤڈ سپیکر کی وساطت سے فضا میں پھیلائے گئے، حکام نے بھی سنے لیکن قانون کے ہاتھ کو ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی اور منادی نے پوری آزادی اور بے تکلفی سے ان الفاظ کو راولپنڈی کے چپے چپے میں دہرایا۔

سکھوں کی اس دیدہ دلیری، حکام کے مجرمانہ سکوت اور مسلمانوں کے بے نظیر ضبط و تحمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی باغ کے قریب، سکھوں کے ہجوم نے گیارہ بجے خون سے ہولی کھیلنے کے وقت سے تین گھنٹے پیشتر ہی، مسلمان راہ گیروں پر اکا دکا حملے شروع کر دیئے جس کی دیکھا دیکھی شہر کے دوسرے حصوں میں بھی بھولے بھٹکے مسلمان مسافروں پر خنجر زنی شروع ہوگئی۔ سکھوں نے اپنی کرپانوں کی پیاس

بجھانے کے لئے ہر اس مسلمان پر وار کیا جو ان کی زد میں آیا۔ انھوں نے بچے، بوڑھے اور عورت کی کوئی تمیز نہ کی۔ دفتروں اور کارخانوں سے واپس آنے والے بے خبر مزدور خاص طور پر ان کے عتاب کا نشانہ بنے۔ کشمیری ہاتویوں کو سامان اٹھوا کر اپنے محلوں میں لے جا کر تہ تیغ کر دیا گیا۔ سڑک پر پڑے ہوئے، زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا، جذامیوں اور کوڑھیوں تک کو نہ چھوڑا گیا تاکہ مسلمان شہدا اور مجروحین کی تعداد میں دقابل فخر) اضافہ کر کے سکھوں کی سورمائی کے افسانے کو حقیقت ثابت کیا جا سکے۔ اس اکا دکا بزدلانہ خنجر زنی کے علاوہ راہ چلتے مسلمان مسافروں پر بندوقوں سے گولیاں چلائی گئیں۔ اب مسلمانوں کے لئے خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ انھوں نے سکھوں کی دراز دستی کا جواب دیا اور اپنی جان اپنے مال اور اپنی آبرو کی حفاظت کے لئے وہ کارروائی کی جو ایک خوددار اور غیور قوم کو ایسے موقعوں پر کرنی چاہیئے۔ مسلمانوں نے خود حفاظتی کے حق کا استعمال کیا جسے مہذب دنیا کا ہر قانون تسلیم کرتا ہے۔ ممکن ہے اس سلسلے میں ان سے کچھ زیادتیاں بھی ہوئی ہوں لیکن عمومی طور پر ان کا رویہ بہت شریفانہ رہا۔

دیہات میں سکھوں کی نقل و حرکت کا مجملاً ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ انھوں نے فسادات کے آغاز سے کئی دن پیشتر ہی اپنا ساز و سامان باہر محفوظ جگہوں میں بھیجنا شروع کر دیا تھا اور آتش زنی سے پہلے وہ اپنے مکانات خالی کر چکے تھے۔ سکھوں کی سرگرمیاں رات بھر جاری رہتیں۔ کئی جگہوں پر خفیہ طریق پر اسلحہ پہنچا کر تقسیم کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں مسلمان بالکل غافل تھے۔ اگر وہ ابتدا ہی سے آمادۂ فساد ہوتے تو وہ اپنے بال بچوں اور املاک کو ضرور محفوظ کر لیتے۔ اگر سکھوں کے الزام کے مطابق، مسلمانوں نے ایک گہری منظم سازش کر رکھی تھی تو وہ اس قدر احمق نہ ہوتے کہ اپنے اہل و عیال اور متاع کو خطرے میں رہنے دیتے۔ اگر سازش کے الزام میں ذرہ بھر بھی صداقت ہوتی تو آج مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے کیمپوں میں پناہ گزینوں کا اس قدر ہجوم نہ ہوتا اور ہندوستانی حکومت کو اضافہ آبادی کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مسلمانوں کا مقصد سکھ کشی نہیں تھا۔ جہاں کہیں انھیں یہ ناگوار فرض ادا کرنا پڑا انھوں نے سفاکی اور بربریت کا بہت کم مظاہرہ کیا ہے۔ شہروں کے جن محلوں اور جن گاؤں میں سکھوں اور ہندوؤں کی آبادی بہت تھوڑی تھی وہ بالکل محفوظ رہے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے ان ہمسایوں

کی پوری حفاظت کی، گو بعد میں مسلمانوں کو حقِ ہمسائگی کی اس شریفانہ ادائیگی کی کافی سزا بھگتنی پڑی۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کے گھروں میں پناہ لی انھوں نے ہی آخر مسلمانوں کو گرفتار کرایا اور ان کے گھروں کو لٹوایا۔

گوجرخاں میں ۹ مارچ تک سکھ سورماؤں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ ۹ اور ۱۰ مارچ کی درمیانی شب کو سکھوں نے شہر پر دھاوا کرنے کے ارادے سے مختلف جگہوں پر مورچے سنبھال لئے اور پورے زور سے ست سری اکال کے نعرے بلند کئے۔ مسلمانوں نے جواب میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے اور خطرے کی اطلاع کے طور پر گولے چلائے۔ اس پر دیہات سے ہزارہا مسلمان شہر میں پہنچ گئے۔ فسادات میں قتل وغارت اور آتش زنی کے واقعات سے کہیں زیادہ افواہیں پھیلتی ہیں۔ فسادات کا باعث عموماً یہی افواہیں ہوتی ہیں اور انھیں سے فسادات کی آگ کو مزید ہوا ملتی ہے۔ ۹ مارچ کو دیہات میں متفرق قسم کی افواہیں پھیلنا شروع ہوئیں کہ گوجرخاں میں مسلمانوں کے مکانات کو جلا دیا گیا ہے، سکول کے چند ایک طالب علموں کو قتل کر دیا گیا ہے اور جامع مسجد کو آگ لگا دی گئی ہے۔ یہ خبریں مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لئے کافی تھیں۔ چنانچہ وہ بپھر کر شہر پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن انھوں نے کوئی کارروائی کرنے سے پیشتر ان خبروں کی تحقیقات کرنا ضروری سمجھا۔ مقامی مسلم لیگ کے کارکن اور شہر کے مسلمان پولیس انسپکٹر فوراً حملہ آور مسلمانوں کے پاس پہنچے اور انھیں یقین دلایا کہ شہر میں بالکل خیریت ہے اور مسلمان بالکل محفوظ ہیں۔ چند آدمیوں نے خود شہر میں پھر کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ باہر پھیلی ہوئی اطلاعات سب غلط ہیں۔ اس پر وہ گھروں کو واپس چلے گئے۔ بنیوں کی منافع بازی سے مسلمان سخت نالاں رہتے تھے۔ ان سے انتقام لینے کا یہ بہترین موقع تھا لیکن انھوں نے اپنے جذبات کو بے قابو نہ ہونے دیا اور اس طرح اپنی جواں مردی اور عالی حوصلگی کا ایک عمدہ ثبوت بہم پہنچایا۔

سکھ طاقت اور تیاری کے زعم میں ہر قیمت پر فساد کی آگ بھڑکانا چاہتے تھے۔ شہر میں امن کمیٹی کی تشکیل ہو چکی تھی جو ہر روز اپنے جلسے منعقد کرتی تھی۔ اس میں تینوں قوموں کے نمائندے شامل تھے۔ مسلمان نمائندوں نے دیانتداری سے اپنے فرض کو نبھاتے ہوئے، اپنی قوم سے گالیاں بھی کھائیں

لیکن انھوں نے قیام امن کی خاطر سب کچھ گوارا کیا اور آخر دم تک شہر کو جہنم بننے سے بچائے رکھا۔ سکھوں کا جوش بے قابو ہوتا جارہا تھا۔ چنانچہ ایک شام دو سکھوں نے گوجرخان کے ایک ہندو پٹواری کو جو سائیکل پر جارہا تھا، کرپانوں سے حملہ کرکے مجروح کردیا۔ پٹواری بے ہوش ہوکر گر پڑا جس سے حملہ آوروں کو یقین ہوگیا کہ وہ مرگیا ہے۔ شہر میں خبر پہنچی کہ مسلمانوں نے ایک ہندو کو قتل کردیا ہے۔ لیکن قدرت نے مسلمانوں کی بے گناہی جلد ہی آشکارا کردی۔ زخمی ہندو نے ہسپتال میں جاکر بیان دیا کہ اس پر دو سکھوں نے مسلمان سمجھ کر حملہ کیا ہے۔ اس نے حملہ آوروں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی اور اپنی چوٹی دکھا کر کہا کہ وہ ہندو ہے لیکن حملہ آوروں نے گالی دے کر کہا کہ یہ محض جان بچانے کے لئے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کررہا ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ زخمی بچ گیا اور اس نے حقیقتِ حال کا اظہار خود ہی کردیا۔ ورنہ ہندو کے قتل کے ذمہ دار لازمی طور پر مسلمان بنتے اور محض اسی ایک واقعہ سے شہر میں فساد کی آگ بھڑک اٹھتی۔

جن دیہات میں سکھوں کی آبادی کافی تھی وہاں سے انھوں نے کافی دن پیشتر ہی اپنا مال واسباب اور عیال باہر بھیجنا شروع کردیا تھا۔ ہر جگہ جلوس نکال کر مسلمانوں کے خلاف نعرے لگائے گئے اور اس کے ساتھ ہی راہ چلتے لوگوں پر کرپانوں سے حملے کئے گئے اور گولیاں چلائی گئیں جس سے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچا۔ چونکہ مسلمان غیر مسلح تھے اور پہلے سے تیار نہ تھے اس لئے انھوں نے جواب میں اس قدر کیا کہ سکھوں کے چند ایک خالی مکانات کو آگ لگادی۔ ضلع راولپنڈی میں سکھوں کے جان ومال کے نقصان کے متعلق مبالغہ آمیز اعداد وشمار نشر کئے گئے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے، سکھوں نے اپنے بال بچے پہلے ہی باہر بھیج دیئے تھے اور آگ لگنے سے پہلے خود بھی گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ مسلمانوں نے کسی جگہ بھی اکا دکا حملہ نہیں کیا۔ جو لوگ بھاگ کر ان کی پناہ میں آگئے تھے ان کی پوری نگہداشت کی گئی اور فوج آجانے پر انھیں بحفاظت تمام پناہ گزینوں کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ اس طرح سکھوں نے اپنا مال بھی محفوظ کرلیا اور اپنی جانیں بھی بچالیں۔ جن دیہات میں ہندو اقلیت آباد تھی وہ بالکل محفوظ رہی ہے کیونکہ جیسا کہ شروع میں ذکر ہوچکا ہے، سکھوں کو بھڑکا چکنے کے بعد ہندو پچھلی صفوں میں چلے گئے تھے اور

فسادات میں انھوں نے بظاہر کوئی (عملی) حصہ نہیں لیا۔

فوج کے آجانے سے عوام نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ شرپسندوں کی چیرہ دستیوں سے آزاد، اپنی طبیعی زندگی گذار سکیں گے لیکن متلاشیانِ امن و سکون کو بہت جلد مایوس ہونا پڑا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے فساد زدہ علاقے کا دورہ کیا۔ بظاہر ان کا مقصد بحالیٔ امن تھا لیکن انھوں نے یہاں آکر کسی ذمہ دار عوامی آدمی کو ملنے کی بجائے اپنی ملاقاتوں اور دیگر سرگرمیوں کا سلسلہ سرکاری حلقوں تک محدود رکھا۔ لاہور سے راولپنڈی روانہ ہوتے وقت، پنڈت نہرو کو پنجاب مسلم لیگ کے لیڈر میاں افتخار الدین نے، کانگرس سے اپنے سابقہ روابط کے پیش نظر ان کے ساتھ چلنے کی پیش کش کی لیکن چونکہ پنڈت جی اپنے سینے میں کچھ اور ہی عزائم لئے ہوئے تھے اس لئے انھوں نے میاں افتخار الدین کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ سردار بلدیو سنگھ، سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے، راولپنڈی پہنچے لیکن، باہمی اعتماد پیدا کرنے کے لئے کوئی ٹھوس کارروائی کرنے کی بجائے، انھوں نے اپنا تمام وقت فوجی انتظامات میں گذار دیا۔ ان انتظامات کا مقصد عوام کو جان و مال کے تحفظ کا یقین دلانا نہیں تھا بلکہ ان سے مقصود محض دہشت زدگی تھا تاکہ مسلمانوں سے موہوم اور فرضی مظالم کا بدلہ لیا جاسکے۔ پنڈت نہرو سے سکھوں نے مطالبہ کیا تھا کہ پنجاب میں فوجی قانون (مارشل لاء) کا نفاذ کردیا جائے۔ اصطلاحی طور پر پنجابی اس لعنت سے بچے رہے لیکن، عملی طور پر، ضلع راولپنڈی میں مارشل لاء ہی جاری ہوگیا جس میں بے گناہوں کے جان و مال کے علاوہ شریفوں کی عزت بھی محفوظ نہ تھی۔

سکھوں نے فوج کی امداد سے اپنی روایتی سکھا شاہی کا اعادہ کردیا۔ ہم سکھا شاہی کی داستانیں اکثر سنا کرتے تھے اور ان سے بیشتر کو مبالغہ آمیز اور افسانہ یا زیادہ سے زیادہ عہدِ کہن کی یادگار سمجھتے تھے لیکن بیسویں صدی میں، تہذیب کے انتہائی عروج کے دور میں، ہم نے اس "شاہی" کا پرتو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سکھوں نے فوجی سپاہیوں کو ہمراہ لے جاکر مسلمان گھروں میں لوٹ مار کی اور مردوں کو پکڑ کر لے آئے۔ سکھ کے محض اشارہ کردینے پر گورکھے فوجی، مسلمانوں کو سنگینوں میں گھیر کر اپنے کیمپ میں لیجاتے۔ رات بھر کڑکڑاتی سردی میں، انھیں بھوکا اور پیاسا رکھتے اور اگلی صبح راولپنڈی جیل میں بھیج دیتے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ گرفتار کرنے اور کرانے والے میں سے کسی کو بھی "مجرم" کا نام یا گھر کا پتہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ گرفتاری کے لئے "مجرم" کا محض مسلمان ہونا کافی سمجھا جاتا تھا۔ یہ گرفتاریاں اس قدر اندھا دھند ہوئیں کہ کوئی بڑا چھوٹا آدمی اس سے بچ نہ سکا۔ سکھوں کو پناہ دینے والے، مسلمانوں کو فساد سے روکنے والے، امن کمیٹی کے ممبر سب سے پہلے پکڑے گئے۔ ان گرفتار شدگان میں ذیلدار، نمبردار، انعام خور، سابق فوجی کپتان، لفٹننٹ، صوبیدار، آنریری مجسٹریٹ، سرپنچ پنچایت وغیرہ سب شامل تھے جن کے سکھوں کے ساتھ گہرے روابط رہے ہیں اور جنھوں نے کئی مواقع پر مسلمانوں کے مقابلے میں سکھوں کی امداد کی ہے۔ گرفتاریوں کا یہ سلسلہ قیامِ پاکستان تک جاری رہا اور اس وقت تک ضلع بھر سے پانچ ہزار سے زائد آدمی گرفتار کئے جا چکے تھے۔ ان میں سے اکثریت ایسے حضرات کی تھی جن کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس سلسلے میں انفرادی مثالوں کی تفصیل کو بخوفِ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے ورنہ قارئین کو اس میں دلچسپی کا کافی سامان ملتا۔

سکھوں نے اپنے نقصانات کی مبالغہ آمیز تفصیل حکام کو بھیجی، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ان کی زندگی بھر کا اندوختہ لٹ چکا ہے لیکن، عملی طور پر، انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کیا۔ کافی عرصے تک وہ فوجی لاریوں میں بیٹھ کر جاتے اور مال و اسباب لاد کر لے آتے۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ بعض لوگوں نے اپنے نقصان کا اندازہ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے تک بتایا، حالانکہ انھوں نے انکم ٹیکس میں کبھی ایک پائی بھی نہ دی تھی۔ انھوں نے اپنا مال و اسباب پہلے ہی محفوظ کر لیا تھا اور ان کا روپیہ بنکوں میں محفوظ تھا۔ مسلمان چونکہ بالکل بے خبر بیٹھے تھے، انھوں نے اپنا ساز و سامان اور زیورات وغیرہ گھروں میں ہی رکھے تھے۔ جاہل اور دقیانوسی ہونے کے باعث وہ روپیہ بھی گھر کے اندر ہی دفن کرنے کے قائل ہیں۔ بہت کم مسلمان اپنا روپیہ بنک میں رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب سکھوں نے، فوج کے سایے میں، مسلمان گھروں میں تاخت و تاراج کی تو نوٹوں کے بنڈل، زیورات اور قیمتی کپڑے وغیرہ سب کچھ اٹھا کر لے گئے۔ کئی مقامات پر سکھوں نے گھروں میں داخل ہو کر مسلمانوں کو چیلنج کیا، "بلاؤ اپنے رسول کو" مسلمانوں کی

فصلیں برباد کردی گئیں۔ بچوں کی گردنوں پر بندوقیں رکھ کر اُن سے جھوٹے بیان دلوانے کی کوشش کی گئی۔ کئی مسلمانوں کو سنگینوں سے زخمی کردیا گیا اور مزاحمت کرنے والوں کو گولی تک مار دینے سے دریغ نہ کیا گیا۔ خانہ تلاشی میں جو سامان، فوج سکھوں کی معیت میں ساتھ لے جاتی اس کی کوئی قانونی رسید مالک کو نہ دی جاتی بلکہ اسے مالِ غنیمت کے طور پر آپس میں تقسیم کر لیا جاتا تھا۔ ضلع میں فسادات کے سلسلے میں جرائم کی تحقیقات کے لئے جو سپیشل پولیس سٹاف مقرر کیا گیا وہ تقریباً تمام ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھا اور ان میں زیادہ وہ پولیس افسر تھے جو خود فساد زدہ علاقہ کے رہنے والے یا اس سے بذریعہ ازدواج وابستہ تھے اور جو صرف مدعی یا گواہ بن سکتے تھے نہ کہ حکم اور ثالث۔ جو ایک دو مسلمان افسر اس اسٹاف میں رکھے گئے انھیں دفتری فرائض سپرد کئے گئے تاکہ وہ "منصفانہ" تحقیقات میں حائل نہ ہوسکیں۔

مسلمانوں کی اندھا دھند گرفتاریوں سے بعض دیہات مردوں سے بالکل خالی ہوگئے: ان کی عدم موجودگی میں بے کس عورتوں اور بچوں کی قابلِ رحم حالت اور کس مپرسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو پولیس، فوج اور وحشی سکھوں کے ناپاک اتحاد کا شکار رہے۔ جو مسلمان خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ابھی تک قانون کی اس لاقانونیت کی دسترس سے محفوظ رہ گئے تھے وہ نالوں اور کھڈوں میں چھپے رہتے تھے۔ اگر وہ سامنے آئیں تو گرفتاری کا احتمال تھا اور اگر چھپے رہیں تو گھر کے سامان اور خواتین کی عصمت لٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ کاروبار اور فصلوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ رہا۔ فصلیں کاٹ کر کھیتوں میں ڈال دی گئی تھیں لیکن اب ان کی مزید نگرانی محال تھی بے چارے کسان دن بھر فوج اور پولیس کے ڈر کے مارے باہر نہ نکل سکتے تھے اور رات کو کرفیو انھیں اور زیادہ پابند کر دیتا تھا۔ کئی ایک جگہوں پر کٹی ہوئی فصلوں کے انبار دن دہاڑے نذرِ آتش کر دیئے گئے۔ صرف ایک گاؤں میں چالیس ایکڑ زمین کی فصل آناً فاناً روزِ روشن میں جل کر خاکستر ہوگئی۔ اس طرح فوج، پولیس اور کرفیو کے سلسلے میں مسلمانوں کو گوناگوں مصائب کا شکار بنایا گیا۔ گرفتار شدگان اگست تک بلا مقدمہ جیلوں میں سڑتے رہے۔ مسلمانوں نے جب اپنے اس نقصان کی اطلاع حکام کو دی تو کورا جواب ملا کہ چونکہ سرکاری طور پر مسلمان ظالم تسلیم کئے جاچکے ہیں اس لئے وہ کسی معاوضہ یا تاوان کے مستحق نہیں۔

فتنہ و فساد کے دوران میں جرائم کو روکنے کے لئے کرفیو کا نفاذ ہر جگہ ہوتا ہے تاکہ شب کی تاریکی مجرموں کے اعمالِ سیاہ کی پناہ گاہ نہ بن سکے لیکن جس کرفیو کا تجربہ مارچ ۱۹۴۷ء کے بعد ہمیں ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود ہی یہ تھا کہ اس کے پردے میں ان جرائم کا ارتکاب زیادہ آزادی سے کیا جا سکے جن کے لئے دن کی روشنی کچھ حارج ہوتی تھی۔ کرفیو کی پابندیاں شہروں کے علاوہ دیہات میں بھی تھیں، حالانکہ ان دیہات سے ہندو اور سکھ جا چکے تھے اور وہاں تصادم کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ دیہات کے مکانات چار دیواری اور چھتیں، فصیل وغیرہ کے تکلفات سے آزاد ہوتی ہیں۔ دیہاتی کسان کا صحن حدود نا آشنا ہوتا ہے۔ گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ لوگ رات کو ان کھلے صحنوں میں یا اپنے مکانوں کی نیچی چھتوں پر سویا کرتے تھے لیکن کرفیو کے نزدیک کسی ایسی جگہ سونا جہاں سے باہر والے دیکھ سکیں، جرم تھا۔ چنانچہ کئی لوگوں کو اس جرم میں گرفتار کیا گیا کہ انھوں نے شب، اپنی تنگ و تار کوٹھڑیوں میں کیوں بسر نہ کی۔

اس سختی پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ رات کو جو فوجی سپاہی گشت کرتے تھے وہ مکانوں کے دروازے کھٹکھٹا کر مکینوں کو باہر نکلنے پر مجبور کرتے تھے۔ باہر جھانکنے والے کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹ لیا جاتا اور کرفیو کی خلاف ورزی کے جرم میں اس کا چالان کر دیا جاتا۔ امن عامہ کے ان محافظوں کے ساتھ عموماً سکھ ہوتے تھے جو مسلمانوں پر اس "شب خون" میں ان کی راہنمائی کرتے۔

کرفیو کی یہ دراز دستیاں تمام پاکستان تک جاری رہیں اور ان کا پورا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اس عرصہ میں ان سے پالا پڑا۔

قتل اور لوٹ مار کے مفروضہ جرم میں گرفتاریوں کے علاوہ ہر روز اس قسم کے ایسے واقعات ہوتے رہے کہ گھروں کی چھتوں پر چند چھپڑوں کو آگ لگا کر شور مچایا جاتا کہ مسلمانوں نے آگ لگا دی ہے۔ ایک دفعہ ایک مونجھالہ بچے کو آگ لگانے کی کوشش میں پکڑ کر تھانے پہنچایا گیا۔ ایک مجذوب کو راہ چلتے ہوئے زدوکوب کرتے ہوئے پولیس کے حوالہ کیا گیا۔ اس پر گوبھارہ کو آگ لگانے کا الزام تھا۔ اس کے برعکس فسادات کے کئی روز بعد دو سکھ ایک گاؤں میں ایک مسلمان کے گھر میں داخل ہو گئے اور دن دہاڑے ایک لڑکی کو زخمی کر کے بھاگ نکلے۔ پولیس کو رپورٹ دی گئی لیکن اس واقعہ کو قابلِ مواخذہ نہ سمجھا گیا۔ اس قسم کے

واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے تھے جس سے مسلمانوں کا جینا محال ہو گیا تھا۔ سول اور فوجی افسروں کے بنگلوں میں ہر وقت ہندوؤں اور سکھوں کا اجتماع رہتا تھا۔ فوجی کیمپوں میں بھی وہ کھلم کھلا آتے جاتے تھے مسلمان اول تو ان حدود کے قریب تک ہی نہ پھٹک سکتا تھا اور اگر کبھی وہ "انصاف" کے ان اڈوں کی طرف کسی غلط فہمی کی بنا پر رخ کرتا تھا تو اس کی بری گت بنتی تھی۔ مسلم لیگ کے کارکن فوج کی دراز دستی کی شکایات لے کر جاتے تو ان کی بے عزتی کی جاتی اور درخواستیں لے کر پھاڑ ڈالی جاتیں۔ گوجر خاں ایریا کا انچارج ایک فرعون مزاج بریگیڈیر تھا، کھلم کھلا مسلمانوں کو گالیاں دیتا تھا۔ وہ مسلمانوں کو للکار کر کہا کرتا تھا کہ اگر تم سکھوں کے گھروں کو جلا سکتے ہو تو تمہارے گھر بھی جل سکتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو جھوٹے، ڈاکو اور قاتل کہا کرتا تھا۔ ایک گاؤں کے مسلمانوں کو، جن کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے گورکھے فوجیوں اور سکھوں کی دراز دستیوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت کی تھی، اس انگریز بریگیڈیر نے پوری سنجیدگی سے دھمکی دی کہ گاؤں کو اڑا دیا جائے گا اور کم از کم سو مسلمانوں کو گولی کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اس نے مقامی ایم ایل اے تک کو گولی مارنے کی دھمکی دی۔

سول اور فوجی حکام کی دہشت خیزی کی یہ مہم پوری سرگرمیوں سے تیز ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو بھوکوں مارنے کی تحریک بھی جاری تھی۔ بلا نغ مردوں کی گرفتاری سے مسلمان کسانوں کا سال بھر کا اندوختہ مناسب اہتمام کی کمی سے برباد ہو چکا تھا۔ دیہات میں گندم، چینی، تیل اور کپڑے کی تقسیم کے ڈپو ہندوؤں اور سکھوں کے پاس تھے جو بیشتر قبل از وقت یا ہراسانی میں، بھاگ گئے تھے۔ ان دیہات میں راشن کی تقسیم کا اب کوئی انتظام نہ تھا۔ عام مسلمان تو کوئی رعایت یا عنایت طلب کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے، البتہ سابق فوجیوں نے اپنی جنگی خدمات کا واسطہ دے کر درخواست دی کہ گاؤں کے ڈپو انھیں دے دیئے جائیں لیکن حکام ان سابق فوجیوں کو زیادہ مجرم سمجھتے تھے۔ چنانچہ کافی عرصہ تک ان دیہات میں ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔

مسلمانوں کو معاشی طور پر خستہ حال کر دینے کی تحریک یہیں پر ختم نہ ہوئی بلکہ پنجاب کے آمر گورنر جنکنز نے ضلع پر تیس لاکھ کا اجتماعی جرمانہ کر دیا۔ اس کی ادائیگی سے غیر مسلموں کو بالکل مستثنیٰ کر دیا گیا۔

مہذب حکومت کی موجودگی میں مسلمان بجا طور پر یہ توقع رکھتے تھے کہ نقصانات کے تناسب سے جرمانہ وصول کیا جائے گا لیکن غیر مسلموں کی بے گناہی اور مسلمانوں کی قصور واری قانوناً تسلیم کی جا چکی تھی اس لئے تیس لاکھ روپے تاوان کا بوجھ صرف مسلمانوں پر ڈالا گیا۔ مسلمان اب تک بدنی تکالیف سہتے رہے تھے اور وہ اس کے کچھ عادی بھی ہو چکے تھے لیکن اس قدر رقمِ خطیر کا تصور بھی انھیں لرزا دینے کے لئے کافی تھا۔ بعد کی آئینی تبدیلیوں سے مسلمانوں کے سر سے یہ بلا ٹل گئی ورنہ وہ اس عظیم بار کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

تشدد و سخت گیری کا یہ دور شروع تھا۔ دشمنانِ ملت اپنے پورے سازو سامان کے ساتھ مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے سرگرم عمل تھے۔ ذرہ ذرہ مسلمان کا دشمن تھا۔ یہ ایک جانکاہ اور جگر سوز داستان ہے۔ لیکن اس کی جانکاہی اور جگر سوزی کا ایک پہلو ایسا تھا جو مسلمانوں کو جسمانی شدائد و مصائب سے زیادہ مضطرب کر رہا تھا ۔۔۔ اور وہ تھی اپنوں کی بیگانگی۔ خضر وزارت کے استعفیٰ کے بعد یہ آئینی حق صرف لیگ پارٹی کا تھا کہ وہ تشکیلِ وزارت کرے کیونکہ وہ ایوان کی سب سے بڑی پارٹی تھی اور اسے بعض غیر لیگی ارکان کی حمایت بھی حاصل تھی۔ لیکن ہندوؤں اور سکھوں کی غوغا آرائی کو بہانہ بنا کر مسلم لیگ کو اس جائز آئینی حق سے محروم رکھا گیا۔ لاہور و امرتسر میں فسادات شروع ہو جانے کے بعد، ۵ مارچ ۱۹۴۷ء کو جب گورنر نے ۱۹۳۵ء کے آئین کی دفعہ ۹۳ کے ماتحت صوبے کا کلی انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا گیا کہ وزارت سازی کا کام جاری رہے گا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد گورنر جینکنز نے ہندو اور سکھ راہنماؤں کے ہم نوا ہو کر یہ عذر پیش کرنا شروع کر دیا کہ چونکہ مسلم لیگ وزارت سے ہندو اور سکھ تعاون نہیں کریں گے اس لئے صوبے میں "فرقہ وارانہ" وزارت نہیں بن سکتی۔ چنانچہ صوبے پر گورنر راج مسلط ہو گیا۔

اس موقع پر لیگ کے پارلیمانی قائدین نے جس عدم تدبر کا ثبوت دیا اس سے لیگ وزارت کے قیام کے خواب اور پریشان ہونے لگے۔ اس سے عوام و خواص میں یہ مطالبہ کافی تقویت پکڑ گیا کہ پارلیمانی

پارٹی کی قیادت کو بدلا جائے۔ اس وقت کے قائدین صوبے میں لیگ حکومت قائم کرنے میں ناکام ہو چکے تھے سوال اُن کی نیت کے اچھا یا بُرا ہونے کا نہیں تھا۔ واضح سوال یہ تھا کہ انھیں ایک اہم معاملہ میں شکست فاش ہوئی ہے جس کے اعتراف کی صورت یہ تھی کہ وہ ذمہ داری کے ان مقاموں سے مستعفی ہو کر دوسرے لوگوں کو سامنے آنے دیں۔

۱۹۴۰ء میں جب مسٹر چیمبرلین آنجہانی نے انگلستان کی وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دیا تھا تو انھیں ایوانِ پارلیمان میں واضح اکثریت حاصل تھی۔ وہ کچھ عرصہ اور برسرِ حکومت رہ سکتے تھے لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ ناروے کی مہم میں انھیں شکستِ فاش ہوئی ہے تو انھوں نے وزارتِ عظمیٰ سے صرف استعفیٰ ہی نہ دیا بلکہ مسٹر چرچل کی وزارت میں ایک ماتحت وزیر کی حیثیت سے خدمت کرنا بھی منظور کر لیا۔ یہ ہے حقیقی خلوصِ نیت اور جذبۂ خدمت جس کا ہمارے قائدین نے کوئی ثبوت بہم نہ پہنچایا۔ ورنہ اس چیز کے امکانات موجود تھے کہ نئے قائدین کے سامنے آجانے سے تشکیلِ وزارت کی راہ ہموار ہو سکے۔

قائدینِ لیگ اپنی بے تدبیری سے وزارت سازی کے امکانات یوں ضائع کر بیٹھے تھے اور صوبے کے مسلمان، آمر گورنر کے عتاب کا پوری طرح شکار ہو رہے تھے۔ مسلمان بے تابانہ دریافت کرتے تھے کہ لیگ کہاں ہے؟ لیگ کے لیڈر کہاں دبکے بیٹھے ہیں؟ عوام کو کافی عرصہ تسلی دی جاتی رہی کہ لیگ کی وزارت بننے والی ہے، سب کام ٹھیک ہو جائیں گے۔ اسی موہوم سی امید پہ مسلمانوں کو ٹالا جاتا رہا۔ مسلمان گوناگوں مصائب میں لپٹتے رہے۔ مقامی کارکن عجیب اُلجھن میں تھے۔ قوم اُن سے جواب طلب کرتی تھی۔ مقامی حکام انھیں غنڈے سمجھتے تھے۔ ضلع اور صوبے کے قائدینِ لیگ تک وہ اپنی چیخ و پکار پہنچاتے تھے لیکن بیچارے عوام اپنے لیڈروں کی صورتوں کو ترستے رہے۔ آپ یہ سُن کر متعجب ہوں گے کہ تین ماہ کے عرصہ میں ایک صوبائی قائد نے علاقہ کا "دورہ" کیا ــــ اور یہ دورہ اس دشوار گذار علاقے میں، جس کی تفصیل دی جا چکی ہے، چوبیس گھنٹے میں مکمل کر لیا گیا۔ ایک قائد، جنھیں پیہم تار بھیجے گئے، کار پر جاتے ہوئے صرف دس منٹ ٹھہرے اور چل دیئے۔ لیڈروں کی اس "رونمائی" سے ہی عوام کے حوصلے بلند ہو گئے لیکن انھیں (عوام کو) یہ شکایت اب تک ہے کہ ان لیڈروں نے ان کے دکھ درد میں شریک ہونا تو درکنار اُن سے

کما حقہٗ آگاہ ہونے کی بھی کوشش نہیں کی۔ لیڈروں کی اس بے رخی کے باوجود جب پنجاب لیگ نے ایک کروڑ روپے کے امدادی فنڈ کے لئے اپیل کی تو محض تحصیل گوجرخاں سے دو ماہ کے عرصہ میں پندرہ ہزار روپیہ چندہ فراہم کر کے بھیجا گیا۔ یہ وہ چندہ ہے جو دیہاتی مسلمانوں نے اپنے طور پر جمع کر کے بھیجا تھا۔ لیگ کی طرف سے اس کی فراہمی کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ یہ چندہ مقامی لیگ کی معرفت بھیجا گیا اور یہ اس رقم کے علاوہ ہے جو ضلع لیگ یا دوسرے ذرائع سے بھیجی گئی۔ مقامی کارکن اپنی بساط اور ذرائع کے مطابق کام کر رہے تھے۔ انھوں نے امدادی مرکز کھول رکھے تھے لیکن سرپرستی کا فقدان تھا۔ ضلع لیگ اپنے کاغذی کارنامے نشر کرنے کی فکر میں تھی اور صوبہ لیگ بالکل بے حس تھی۔ اس سارے عرصے میں کئی ایک چٹھیاں صوبہ لیگ کو لکھی گئیں لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ صوبہ لیگ نے کسی ایک چٹھی کی رسید تک بھیجنا مناسب نہیں سمجھا۔ مصیبت زدہ علاقے کے وفود لیگ لیڈروں کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے لیکن انھیں نہ صرف مایوس بلکہ شکستہ خاطر ہو کر لوٹنا پڑا۔ ایک ابتدائی لیگ کے صدر، جو ایک بے لوث اور گرمجوش کارکن ہونے کے علاوہ دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے بھی خاص حیثیت رکھتے تھے، ایک قائد لیگ کو اپنی شکایات نوٹ کروا رہے تھے کہ ایک اور قائد نے آ کر کہا "کیوں صاحب! فلاں صاحب کے ہاں چائے پر جانا آپ کو یاد نہیں رہا؟" اس پر وہ قائد اسی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کارکن مذکور رات تک انتظار کرنے کے بعد گھر واپس آ گیا۔ اس قسم کی دل شکنی ہر اس شخص کی ہوتی تھی جسے اپنے لیڈروں کے قریب تر جانے کا اتفاق ہوا۔

صوبائی قائدین کو ایک ہی فکر دامن گیر تھی کہ صوبے میں وزارت سازی کے امکانات کس قدر ہیں (اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ امکانات ان کی اپنی بے تدبیری سے ضائع ہو چکے تھے) اس کے برعکس ہندو اور سکھ پنجاب سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے اپنی ان تیاریوں میں مصروف رہے جن کا اعلان وہ کھلم کھلا کرتے رہے تھے۔

ماسٹر تارا سنگھ اور دوسرے سکھ لیڈروں نے پنجاب کے ہر چھوٹے بڑے مقام کا دورہ کرنے کے علاوہ ہندوستان کے طول و عرض میں سرمایہ اور سپاہی فراہم کرنے کے لئے شب و روز ایک کر رکھے تھے۔

ان کی تیاریاں خفیہ تھیں لیکن ان کی نقل و حرکت اور دیگر سرگرمیاں کھلم کھلا تھیں۔ ان کی پوری تشہیر اخبارات میں ہوتی تھی جس سے ان کے عزائم خفیہ نہیں رہے تھے۔ ذیل میں صرف چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۲۵ر مارچ ۱۹۴۷ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ایسوی ایٹڈ پریس کی یہ خبر چھپی:-

کل کلکتہ کے ہندو مہاسبھا لیڈروں اور کئی ایک ممتاز سکھوں نے ماسٹر تارا سنگھ سے ملاقات کی اور پنجاب کی صورت حالات کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے انھیں بتایا کہ پنجاب اور بنگال کے مسائل ایک ہی قسم کے ہیں۔ انھوں نے بنگال کے مہاسبھا لیڈروں کو یقین دلایا کہ پاکستان کے خلاف جنگ میں پنجاب ان کی امداد کرے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر بنگال اور پنجاب متحد ہو جائیں تو ہندوستان میں پاکستان نہیں بن سکے گا۔ . . . . . اس کے بعد گوردوارہ جگت سدھار میں تقریر کرتے ہوئے ماسٹر تارا سنگھ نے کہا کہ پنجاب میں جو کچھ ہوا اسے فرقہ وارانہ فساد نہیں کہا جا سکتا یہ ہندوستان میں خانہ جنگی کا آغاز ہے کیونکہ پنجاب کی جغرافیائی حیثیت ایسی ہے کہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ یہیں ہوگا۔

۲۸ر مارچ کو کانپور کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے ماسٹر تارا سنگھ نے کہا:

ہندوؤ اور سکھو! متحد ہو کر ایک جان اور ایک قوم بن جاؤ۔ اپنے تمام اختلافات ختم کر دو۔ ہر صبح اور ہر شام دعا کرو کہ ہم پنجاب میں کامیاب ہوں کیونکہ پنجاب میں ہماری جنگ فیصلہ کن ہوگی۔

(سول اینڈ ملٹری گزٹ ۲۹ر مارچ ۱۹۴۷ء)

۹ر جولائی کو لاہور میں سکھوں کے ایک اجتماع عظیم میں ایک قرارداد اس مضمون کی منظور کی گئی کہ اگر تقسیم پنجاب کی کسی تجویز سے ان کی وحدت برقرار نہ رہی، انھیں نہروں اور نہری علاقوں میں سے مناسب حصہ نہ مل سکا اور ان کے مقدس گوردوارے مشرقی پنجاب میں نہ آسکے تو انھیں یہ تقسیم منظور نہیں ہوگی اور اس سے تلخی اور مشکل صورت حالات پیدا ہو جائے گی۔

دربار صاحب امرتسر میں اسی صبح کو مختلف سکھ لیڈروں نے اپنی تقریروں میں کہا کہ اگر سکھوں کی

وحدت برقرار نہ رکھی گئی تو سخت جنگ شروع ہو جائے گی۔

دہلی کے گوردوارہ سیس گنج میں تقریر کرتے ہوئے حکومت ہند کے وزیر دفاع بلدیو سنگھ نے کہا کہ مسلم لیگ نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندو اور سکھ ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

اسی قسم کے عزائم کا اعلان ہندوستان کے چپے چپے پر کیا گیا اور یہ سلسلہ تقسیم پنجاب تک جاری رہا۔ اس کے ساتھ ہی غیر مسلموں نے مغربی پنجاب سے وسیع پیمانے پر انخلاء شروع کر رکھا تھا۔

مقامی لیگ کارکنوں نے حکام اور قائدین لیگ کو اپنے ان بجا خدشات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ یہ انخلاء اور اسلحہ کی نقل و حرکت غیر مسلموں کے کسی طے شدہ پروگرام کا حصہ ہے۔ حکام پر تو کیا اثر ہونا تھا، قائدین لیگ نے بھی کوئی جنبش نہ کی۔ انہیں کہا گیا کہ اگر وہ غیر مسلموں کی ان خطرناک سرگرمیوں کو روک نہیں سکتے تو کم از کم مسلمانوں کو مدافعت کیلئے تیار کرنے کا سامان کریں۔ اپریل میں صوبائی حلقوں میں اس قسم کی تحریک ہوئی کہ مختلف علاقوں سے ایسے سابق فوجیوں کے ناموں کی فہرست بھیجی جائے جو مسلمانوں کو مدافعانہ کارروائی کیلئے تیار کر سکیں۔ کارکنوں نے دیہات میں جا کر ایسے مسلمانوں کے ناموں کی فہرست لاہور بھیجی جو بخوشی ایسی خدمت سرانجام دینے کو تیار تھے۔ لیکن اس کے بعد حسب معمول کوئی مزید حرکت نہ ہوئی۔ لیڈروں کی اس بے حسی کا نتیجہ یہ ہوا اور یہی ہونا تھا کہ مسلمان بالکل غافل ہو گئے۔

پہلی آزمائش میں ہی قوم اور لیڈروں میں بے گانگی آشکارا ہو گئی۔ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ لیڈر قوم سے بہت دور ہیں اور وہ قوم کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ اس حقیقت کا مزید ثبوت ان واقعات نے مہیا کر دیا جو قیام پاکستان کے ساتھ مشرقی پنجاب میں رونما ہوئے۔ لیڈروں کے تعدد نے مجاہدوں اور صف شکنوں کی قوم کو بھیڑوں بکریوں کی طرح فرار ہو جانے یا بزدلی کی موت مر جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے صرف ضلع راولپنڈی کے واقعات کو لیا ہے اور انہیں بطور مثال پیش کر رہا ہوں۔ آپ کسی ضلع سے دریافت کیجئے اس کی سرگذشت راولپنڈی سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوگی۔ قیامت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھی ہمارے لیڈروں کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ آج جب کہ پوری ملت پاکستان اندرونی و بیرونی خطرات سے گھری ہوئی ہے، اور بقول قائد اعظم پاکستان کو قومی الیر جنسی درپیش ہے، ہمارے ان لیڈروں کی دلچسپی کا مرکز اسی قدر ہے کہ وزارت میں فلاں شامل ہو

اور فلاں نہ ہو۔ پنجاب کی اتنی بڑی قیامت کے بعد بھی وہاں کے لیڈروں نے وزارت کی خاطر جو کچھ کیا اور اب تک جو کچھ کر رہے ہیں وہ اس چیز کا ثبوت ہے کہ انھیں قوم کے مصائب سے کوئی ہمدردی نہیں بلکہ صرف ذاتی تفوق عزیز ہے۔

مغربی پنجاب کے مظلوم اور مشرقی پنجاب کے بقیۃ السیف نیم جان، متاع بردہ مسلمان بیگانوں کے ظلم کو شاید بھول جائیں لیکن "آشناؤں" کی بیگانگی کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

۱۵ اگست

انسانی تاریخ کے اوراق پیچھے کو الٹتے جایئے۔ کاغذ سے دھاتوں اور دھاتوں سے پتھروں، محلات سے جھونپڑوں اور جھونپڑوں سے غاروں تک کے ازمنہ مظلمہ میں پہنچ جایئے۔ اس کی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے خاکے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی، خیالات بدلیں گے، طرز بود و ماند بدلے گا، اسلوب رفتار و گفتار بدلے گا۔ لیکن اعصار و دہور کے اس تضاد و تباین اور امصار و دیار کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی۔ اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ **آزادی** کی حمد و ستائش میں لاہوتی نغمے گائے ہیں۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوجا ہے لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور، بلا تخصیص زمان و مکان ہمیشہ عقیدت کے پھول چڑھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا تک کے منکرین مل جائیں گے، لیکن کسی ایک دور میں ایسا گروہ کوئی نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جدوجہد کی مسلسل داستان۔ مختلف ادوار میں نماردہ و فراعنہ زماں اور اکاسرہ و قیاصرہ دہر، ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ کمزور انسانوں کے سینہ سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے۔ لیکن کمزور ناتواں انسانوں نے اپنا سب کچھ لٹا اور مٹا گوارا کر لیا مگر آزادی کی حسین آرزوں کو اپنے دل کے کاشانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ اس نے اس قربانگاہ پر اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگِ ساحل پر ان گنت موجیں آئیں اور مختلف نقوش کو بہا کر ساتھ لے گئیں۔ لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی

مسلسل تگ و تاز کے باوجود کبھی مٹ نہ سکا تو وہ اس بطلِ جلیل کے نام کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دیدی۔ یا پھر اس باعثِ ننگِ انسانیت کا نام جس نے اپنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بیچدیا۔ بہرحال دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانوں سے ماپا اور اسی کے میعار لیا سے جانچا ہے، بایں نمط کہ آزادی دنیا کی ہر لغت میں شرف و مجدِ انسانیت کے مرادف اور غلامی، ذلت و خواری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی بالآخر کیا شے ہے جو انسان کے لئے اس درجہ مرغوب و مقصود بن چکی ہے۔ اگر آزادی وہی ہے جس کا غلغلہ ہم بھی ایک سال سے سن رہے ہیں تو ہمیں حیرت ہے کہ انسان کو کیا ہو گیا کہ اس نے اس کی خاطر زمین اور آسمان کو ایک کر رکھا ہے!

ہم گذشتہ ایک سال سے آزاد ہیں۔ پچھلے سال بھی ۱۵ اگست کو ہم نے آزادی کا جشن منایا تھا۔ آج ایک سال بعد پھر ویسا ہی جشنِ آزادی منا رہے ہیں۔ آزادی کا یہ تہوار اب ہر سال منایا جایا کرے گا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے اس ظاہری شور و غوغا اور سطحی دھوم دھام کے ہماری حیاتِ اجتماعیہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ ہم وہی کچھ ہیں جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے تھے۔ ہم وہیں ہیں جہاں اس تاریخ آزادی کے وقت تھے۔ بلکہ ایک لحاظ سے اس سے بھی کچھ پیچھے۔ ہم اب آزاد ہیں۔ قانونی اور آئینی معنوں میں پوری طرح آزاد۔ لیکن کیا آزادی کے نتائج بھی کچھ ہوتے ہیں جن سے ہم دوچار ہیں؟ کیا یہی وہ آزادی ہے جس کے نغمے فطرتِ انسانی کے ساز سے ہمیشہ ابھرتے، ابلتے رہتے ہیں؟ کیا ہم خود اسی آزادی کا مطالبہ کیا کرتے تھے؟ اگر آزادی اسی کیفیت (بلکہ عدم کیفیت) کا نام ہے تو ہمیں اعتراف کر لینا چاہئے کہ یا تاریخ کی رصد گاہوں کے تمام نقوش باطل ہیں یا ہم نے کہیں دھوکا کھایا ہے۔

کہنے کو ہم آزاد ہیں، ہر معنی میں آزاد۔ لیکن ہمیں سال بھر میں ایک مرتبہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ اس آزادی نے ہم میں کونسی تبدیلی پیدا کی کہ جس کے باعث ہم اس آزادی کی زندگی کو سابقہ غلامی کی زندگی پر ترجیح دیں۔ تو ظاہر ہوا کہ اس بظاہر آئینی آزادی میں کسی ایسی شے کی کمی ہے جس سے آزادی اور غلامی میں چنداں امتیاز نظر نہیں آتا۔ آیئے دیکھیں کہ "سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے" کے مصداق کون "تو"

ہم میں نہیں۔ آئیے دیکھیں کہ اس ہیلٹ کی داستان میں وہ کون شہزادہ گم ہے جس سے یہ داستان اس درجہ بے کیف ہو کر رہ گئی ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مسلم کانفرنس (لاہور) کے خطبۂ صدارت میں اس امر کا ذکر کرتے ہوئے کہ ارباب کانفرنس نے ایک مفکر Visionary کو صدارت کے لئے چنا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ

قومیں فکر سے محروم ہو کر برباد ہو جاتی ہیں

آج ہماری یہی کیفیت ہے۔ ہم سیاسی آزادی سے تو ہم کنار ہو چکے ہیں لیکن فکر سے محروم اور تہی ہیں۔ آزادی، غیر کی غلامی (سیاسی استیلا) کی عدم موجودگی کی سلبی کیفیت کا نام نہیں۔ آزادی مثبت شے ہے۔ یہ لاالٰہ کی وادی میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ گلستان الا اللہ کی دائمی بہار ہے۔ آزادی ظلمت نہیں کہ عدم نور کا نام ہو بلکہ یہ نور کی مثبت موجودگی ہے کہ جس سے زندگی کا ہر گوشہ صد خاور بداماں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی خارج سے مسلط نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کا فوارہ اعماقِ قلوب سے پھوٹتا ہے۔ یہ اس وقت تک مثبت کیفیت نہیں بنتی جب تک کہ "ما بانفسہم" کے تغیر و تبدل کی آئینہ دار نہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہمیں صلاحیت کے بغیر مل گئی ہے۔ یہ ہماری سعی و عمل اور تگ و تاز کا نتیجہ نہیں۔ اسی لئے خدا کا یہ بخشیدہ بہشت "ہیچ" معلوم ہوتا ہے[1]۔ اور یہ ہیچ ہی معلوم ہوگا جب تک یہ موہبتِ الٰہی اس مقصد کے لئے استعمال نہ ہو جس کے لئے یہ عطا ہوئی ہے۔ یہ استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ پیش نہاد کیا ہے اور وہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ فریضہ صاحب فکر کا ہے اور ہماری بدبختی کہ

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

ہندی سیاست کا ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا عشرہ ہمہ گیر رقص اور پیچ و تاب کا منظر پیش کرتا ہے۔ ایک عام ہیجان و طوفان تھا۔ لیکن اعمال باطل ہو رہے تھے اور ان کا کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ قوم ایسا تخم بوری تھی جس کا کچھ حاصل نہ تھا، وہ اس راہ پر چل رہی تھی جس کی منزل نہ تھی۔ عین اس حال میں

---

[1] آن بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ ۔ تا جزائے عملِ تست جاں چیزے ہست

ایک صاحبِ فکر نے قوم کو ایک تصور دیا۔ وہ تصور شاعر کا خواب اور مجذوب کی بڑ معلوم دیتا تھا۔ لیکن اس میں جادو تھا۔ اس نے قوم کو قوم بنا دیا۔ بکھرے دانوں کو ایک تسبیح میں پرو دیا۔ دس کروڑ کے ہجوم کو ملتِ واحدہ بنا کر ایک جھنڈے، ایک پلیٹ فارم اور ایک لیڈر سے وابستہ کر دیا۔ انتشار میں مرکزیت پیدا ہو گئی، باطل اعمال نتیجہ خیز ہونے شروع ہو گئے اور ائتلاف کی وہ نعمت میسر آنے لگی جو قرآن کے الفاظ میں دنیا بھر کے خزانوں کے عوض میں بھی میسر نہ آسکتی۔

وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ۚ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (۸/۶۳)

اور وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں باہم ائتلاف پیدا کر دیا۔ اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین پر ہے جب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا۔ لیکن یہ اللہ ہی ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔ بلاشبہ وہ (اپنے کاموں میں) غالب اور حکمت والا ہے۔

ائتلاف وحدتِ مقصد و وحدتِ منزل سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مقصد و منزل متعین ہو گئے تو قوم کی ہر حرکت اس متعین منزل کی جانب ہو گئی۔ ملت نے بالآخر اس منزل کو پا لیا۔ لیکن پس چہ؟ وہ منزل مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک خوب تر منزل کا سنگِ میل ہے۔

تقسیمِ ہند سے ایک طرف ہندو نے آزادی حاصل کر لی ہے اور دوسری طرف مسلمان نے ایک قطعۂ ارض حاصل کر لیا ہے۔ ہندو کے نزدیک تصورِ آزادی محض یہ تھا کہ بدیشی راج باقی نہ رہے اور کاروبارِ حکومت دیسیوں، ملکیوں (ہندوؤں) کے ہاتھ میں آجائے۔ یہ اس کی منزلِ مقصود تھی۔ اب جب وہ یہاں تک پہنچ گیا ہے تو وہ مطمئن ہے کہ وہ آزاد ہو گیا۔ لیکن مسلمان کی حالت مختلف ہے۔ یہ اس موجودہ آزادی کو منزل نہیں متصور کرتا۔ اس کے نزدیک آزادی نشانِ منزل ہے۔ لیکن اب وہ کشمکش میں مبتلا ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس کے تحت الشعور میں ایک خلش ہے، مبہم خلش، جس کا علاج اسے میسر نہیں۔ وہ دنیا کی حکومت قائم کرتا ہے

تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے کہ پاکستان کو اس نے نظام قرآن رائج کرنے کے لئے حاصل کیا تھا۔ اگر نظام قرآن رائج کرنے کی طرف آتا ہے تو اسے معلوم نہیں کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ قوم ذہنی انتشار میں مبتلا ہے۔ نظام قرآن کا خواب کثرت تعبیر سے پریشان ہو رہا ہے۔ ماضی کے مخصوص حالات نے ملا کو مذہب کا خصوصی اجارہ دار بنا دیا ہے۔ ملا اسلام و قرآن کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ رجعت پسندانہ دقیانوسی اور ناقابل قبول و عمل ہے۔ اس کے اپنے مقاصد ہیں جن کا وہ تحفظ چاہتا ہے۔ زکوٰۃ، خیرات کی مدات اس کی تحویل میں دیدی جائیں تو وہ مطمئن ہو جائے گا کہ مذہب کی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن یہ مذہب چند رسوم کا نام ہے۔ غیر مذہبی امور کے لئے "دنیاوی حکومت" لازمی ہے۔ دنیاوی حکومت کی زمام مغرب زدہ ہاتھوں میں ہے۔ ان کا مغربی تصور اجتماعیت و حکومت مسلمانوں کے مزاج قومی کے مطابق نہیں۔ ارباب حکومت مغربی فضا کے تربیت یافتہ ہونے کی حیثیت سے معذور ہیں۔ وہ صرف مغرب کا نظام ہی رائج کر سکتے ہیں۔ عوام کا تقاضا اور ان کی کیفیت جداگانہ ہے۔ مسلم لیگ نے اپنی دس سال کی سیاسی جدوجہد میں ان کے تحت الشعوری خلش کو ابھارا کہ پاکستان نفاذ نظام اسلامی کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے۔ اگر عوام کو ان خطوط پر نہ تیار کیا جاتا یا ان کی اس خلش کو یوں برانگیخت نہ کیا جاتا تو آج ان کا مطالبہ شاید اور ہوتا۔ مسلم لیگ نے دانستہ ان کو اس طرح ابھارا اور اب کیفیت یہ ہے کہ وہ غیر مطمئن ہیں۔ قیام پاکستان سے صرف وہی طبقات و افراد مطمئن ہو سکے ہیں جن کے قلب میں کوئی خلش نہیں تھی۔ جن کے پیش نظر ذاتی مناصب و شخصی منافع تھے اور وہ ان کے حصول میں مصروف ہیں۔ جہاں تک ارباب حکومت کے مغرب زدہ تصور سیاست کا تعلق ہے پاکستان کا مل جانا اطمینان بخش ہے۔ وہ خود تو مطمئن ہیں لیکن جو مطمئن نہیں انہیں وہ شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ دیوانے — باغی — پاکستان کے خلاف ہیں۔

عوام غیر مطمئن ہیں کیونکہ ان کی جس خلش کو برسوں ابھارا جاتا رہا اس کی تسکین کا اب کوئی سامان نہیں۔ حتیٰ کہ روٹی کا مسئلہ جو غریب کے سامنے سب سے پہلے آتا ہے پاکستان میں اس کا بھی اطمینان بخش حل نہیں۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ اس ضمن میں جو حل پیش کرتے ہیں حکومت انہیں شک سے دیکھتی ہے۔ اور عوام کو

ان سے دور رکھنے کے لئے اسلامی کمیونزم وغیرہ قسم کی مغالطہ انگیز اصطلاحات سے کام لیتی ہے۔ تاکہ انھیں یہ افیون دے کر سلا دے۔ اس نے اوپر کے طبقہ کو منافق بنا دیا ہے۔ منافقت پھر عدم اطمینان کا باعث ہے۔ اطمینان اسلام میں ہے یا کفر میں، منافقت میں نہیں۔ (منافقین کے لئے جہنم میں بھی درک اسفل ہے۔) پھر دیکھئے، قوم کی حالت کیا ہے؟ ملا کے مقاصد رجعت پسندانہ اور خود غرضانہ ہیں۔ ارباب اقتدار کی روش منافقانہ ہے۔ عوام کے تحت الشعور میں جو خلش ہے اس کا کوئی علاج نہیں۔ ان کی روٹی کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ وہ غیر مطمئن ہیں۔ جنوں زدہ طبقہ میں بغاوت کے آثار ہویدا ہیں۔

ایسے میں کیا ہوگا؟ اس عدم اطمینان اور منافقت کے طبقاتی گرداب سے قوم بچ سکتی ہے تو کسی صاحب فکر کے صدقہ میں بچ سکتی ہے۔ مسلمانوں کا صاحب فکر اقوام دیگر کے اصحاب فکر سے مختلف اور نرالا ہوتا ہے۔ یہ صاحب فکر ہی نہیں ہوتا، صاحب جنوں بھی ہوتا ہے۔ اس میں عشق و عقل، نظر اور خبر کا امتزاج ہوتا ہے۔ وہ تنہا عقل نہیں ہوتا کہ مصلحت کوشیوں پر نگاہ رکھے اور جرأت رندانہ سے محروم ہو، نہ وہ محض جنوں ہوتا ہے کہ اسے پاس گریباں بھی نہ ہو۔ وہ اس کی تفسیر ہوتا ہے کہ

باچنیں زور جنوں پاس گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کار ہر دیوانہ نیست

لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ مستقبل اس کے ہاتھ میں ہے جس کا سینہ کشمکش کی آماجگاہ ہے کیونکہ

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

ایسا صاحب فکر کہ اس کے سینہ میں قرآن کی تڑپ ہو، اس کے فکر کی روشنی میں قرآن کا مطالبہ کیا جائے تو ایسا نظام متعین ہو سکتا ہے جس میں ہر ایک کو صحیح اطمینان حاصل ہو جائے اور ملت اس نور ربانی کی روشنی میں اپنی منزل صحیحہ کی جانب گامزن ہو سکے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر وہ حقیقی آزادی میسر آئے گی جس کے بغیر ہماری موجودہ آزادی ایک بادہ ہے بے کیف۔ ایک جسد ہے بے روح۔ اس کے بغیر ہم آئینی آزادی نے

تو شاید ہم کنار رہ سکیں اس حقیقی آزادی کو کبھی پا نہیں سکیں گے جو ان ہتھیار اطواق و سلاسل کو توڑتی ہے جو انسان نے از خود پہن رکھی ہیں۔ آزادی کے یوم ہر سال آئیں گے اور گزر جائیں گے۔ ہم خوشیاں بھی منائیں گے لیکن اس استخواں خوری سے کچھ نفع نہیں ہوگا جب تک ہم مغز تک نہیں پہنچیں گے۔ یوم ہائے آزادی کے جشن بے روح بن کے رہ جائیں گے اور بس۔

اس حقیقی آزادی کے حاصل نہ ہونے سے پاکستان کے قیام نے ہم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی اور ہم بدستور وہیں ہیں جہاں قیامِ پاکستان سے پیشتر تھے۔ ہم اگر بدستور فروعات میں الجھے رہے اور ظواہر و رسوم کے غلام بنے رہے تو جو کچھ ہونے والا ہے اس کا پرتو بھی دیکھ لیجئے۔ ملا اور اربابِ حکومت میں سمجھوتہ ہونے کے امکانات قوی ہیں۔ ایسا ہو گیا تو ہماری ساری جدوجہد اکارت جائے گی۔ اور تاریخ نئے اوراق الٹنے کے بجائے پرانے اوراق الٹے گی۔ ہم غیروں کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنوں کے غلام ہو چکے ہوں گے۔ پاکستان باقی مسلمان سلطنتوں کی طرح ایک سلطنت بن جائے گی۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ وہاں ایک شخص کی حکمرانی ہے یہاں متعدد اشخاص کی ہوگی۔ وہ شخصی اجارے ہیں یہ مشترکہ ادارہ ہوگا "تخت و مصلیٰ" کا ابتلا مسلمانوں کی تاریخ میں ایک عظیم حادثہ ہوگا۔ ایسا صدمہ جس سے جانبر ہونا صدیوں کی بات ہو جائے گی۔

لہٰذا آیئے! یوم آزادی منانا ہے تو عہد کیجئے کہ حقیقی آزادی سے ہم کنار ہو کر رہیں گے۔ اس کی یہی صورت ہے کہ قرآن نے جن اطواق و سلاسل کو ایک بار توڑا تھا اور جن کے ٹوٹے حلقوں کو جوڑ کر ہم نے پھر وہی زنجیریں تیار کر لی ہیں آج پھر ان زنجیروں کو ایک جھٹکے سے توڑیں اور حیاتِ اجتماعیہ کو اس قالب میں ڈھال لیں کہ محکومیت صرف اللہ کی جائز ہے۔ انسان کو انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ انسان نہ حاکم ہے نہ محکوم۔ وہ خدائی قوانین کا نفاذ کرنے والا اور آپس میں اختلاف اور رحم سے کام لینے والا ہے۔ گویا بالفاظِ صحیح تر ہم قرآن اور اسلام کا نظام اپنے اوپر مسلط کریں اور انسانیت کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرائیں۔ یاد رکھئے، یہ تسلط صرف قدمِ اول کا منتظر ہے۔ آیئے جراتِ ایمان سے کام لیں اور یہ قدمِ اول اٹھائیں۔

لیکن اس "زورِ جنوں" میں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ ہونے دیجئے کہ جس نظام کو ہم مسلط کرنا چاہتے ہیں وہ اس سرزمین کے ٹکڑے کے بغیر کبھی مسلط نہ ہو سکے گا۔ جو ہمیں خدا کی موہبت سے مل گیا ہے۔ جسم کے بغیر اس عالم اسباب میں، جان کا تصور ممکن نہیں۔ اس لئے اس قطعۂ زمین کا تحفظ نہایت ضروری ہے کہ ــــــ غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے ــــــ اس سرزمین کی بخشائش پر ہماری گردنیں اس بارگاہِ صمدیت کے حضور، دفورِ تشکر و امتنان سے جھک جاتی ہیں جس نے ہم ناتوانوں کو اس عطیۂ عظمیٰ سے نوازا۔ اسی سے ہم استعانت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرما دے کہ ہم اس سرزمین کو اس کے تختِ اجلال کی جولانگاہ بنا سکیں۔

اور جب خدا کے حضور سجدۂ تشکر کا ذکر آیا ہے تو بعید از سپاس گذاری ہوگا اگر ہم قوم کے اُس "مخلص وکیل" کا شکریہ ادا نہ کریں جس نے اپنی فراست و دیانت سے اتنا عرصہ بلا مزد و معاوضہ قوم کا مقدمہ لڑا اور اسے اس سرزمین کا قبالہ لے دیا۔ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اس محسنِ ملت کی زیر بارِ احسان رہیں گی۔ لیکن پاکستان کا استحکام اس "ڈگری" حاصل کر لینے سے نہیں ہوگا۔ یہ مشروط ہوگا ہماری اپنی صلاحیتوں پر۔ اور یہ صلاحیتیں "ایمان و اعمال صالحہ" کے بغیر ناممکن ہیں۔

قوم پوچھتی ہے...

پاکستان کے وزیر مالیات جناب غلام محمد صاحب نے جو ان دنوں کفالتی قرضوں (Sterling Balances) کے تصفیہ کے سلسلہ میں انگلستان تشریف لے گئے ہوئے ہیں، ۱۵ جولائی کو لندن میں ایک اخباری ملاقات کے دوران میں مابعد تقسیم (ہند) کے فسادات کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو موردِ الزام قرار دیتے ہوئے کہا:

جب ان حادثات کی تاریخ لکھی جائے گی تو ان کا الزام ایک حد تک، بلکہ تقریباً کاملاً اس شخص پر آئے گا جو اس وقت وائسرائے تھا۔ . . . . پنجاب کے فسادات ایک گہری سازش کا نتیجہ تھے۔ اس سازش میں ایک طرف سکھوں کا وہ جنگجو طبقہ شریک تھا جو وہاں اپنا راج قائم کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف راشٹریہ سیوک سنگھ کے یہ کمینہ عزائم تھے کہ مسلمان آبادی کا صفایا کر کے پاکستان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تقسیم سے پہلے حکومت ہند کو ان سرگرمیوں کا بخوبی علم تھا لیکن ان کے سدباب کے لئے کچھ کاروائی نہیں ہوئی۔ وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پورا علم تھا کہ یہ فتنہ کھڑا کیا جا رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اسلحہ جمع کیا جا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ سکھ کیا کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو کیسے ستایا جا رہا ہے۔ اس کی سی آئی ڈی نے یہ معلومات اسے بہم پہنچا دی تھیں اور اس کے رفقائے کونسل اسے کارروائی کی دہائی دے رہے تھے۔ اس نے کہا "اگلے ہفتے" یا "اس سے اگلے ہفتے"۔ جب اس کی کابینہ کے مسلمان ارکان رخصت ہوئے تو اس نے انھیں بھی تسلی دی۔

تقسیم کی تعجیلی تنفیذ کا الزام دیتے ہوئے جناب غلام محمد نے کہا:

یہ (تقسیم) دو ماہ میں عاجلانہ طور پر مکمل کر دی گئی اور یہ غلط فیصلہ تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی بڑی

خواہش تھی کہ وہ صاحب قوت ہونے کا ثبوت دے اور سب کچھ سوا کر چھوڑے۔ پانچ لاکھ آدمی قتل اور زخمی ہوئے ہیں۔ ان کے وہ آبائی گھر برباد ہو گئے ہیں جہاں وہ ہزار سال سے رہتے چلے آرہے تھے۔

لارڈ مونٹ بیٹن میں بہت سے اوصاف ہیں اور میں ان کا مداح ہوں۔ لیکن اس میں بہت کچھ عیب بھی ہیں۔ بین اور روشن واقعات کے علی الرغم اپنی بعض کارروائیوں پر بضد ہونا یقیناً سیاست دانی نہیں۔ لارڈ مونٹ بیٹن پاکستان اور ہندوستان کا واحد گورنر جنرل بننا چاہتا تھا۔ یہ خواہش اس پر بھوت کی طرح سوار تھی۔ (ڈان ۹ ۸ ۔ ۶)

اسی موضوع پر گفتگو فرماتے ہوئے ۱۱ر جولائی کو مری میں مسٹر غضنفر علی مرکزی وزیر مہاجرین نے "دو ایک حقائق کا اضافہ" فرماتے ہوئے انکشاف فرمایا:۔

تقسیم سے پہلے میں نے لارڈ مونٹ بیٹن کی خصوصی توجہ ان تیاریوں کی طرف دلائی جو سکھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ والے کر رہے تھے تاکہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر بھرپور وار کریں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے اور ذرائع سے بھی یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں اور اس نے سکھ لیڈروں کو تنبیہ کر دی ہے۔ بعد میں لارڈ مونٹ بیٹن نے مجھے حتمی ضمانت دی کہ اگر کسی فرقہ نے فساد شروع کیا تو وہ سخت گیرانہ کارروائی کرے گا تاکہ امن بحال رہے اور وہ اپنی ذمہ داری کا مکمل احساس رکھتا ہے۔ اس کے صحیح الفاظ یوں تھے کہ امن برقرار رکھنے کے لئے وہ چند ہزار نفوس کو مار دینے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ لیکن جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تو میں نے ۱۴ر اگست کو کراچی میں اسے اپنا وعدہ یاد دلایا تو اس نے سرد مہری اور عدم توجہی کا مظاہرہ کیا۔ پنجاب کی صورت حال سے متعلق میں اس سے صرف یہ کچھ اگلوا سکا کہ قانون حسب معمول حرکت کرے گا اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔

نیم سرکاری اخبار ڈان نے اس ضمن میں چند ایک اور "حقائق" کا اضافہ کیا۔ ۱۰ر جولائی کے دوسرے اداریتی مقالہ میں اس نے اس جواب دعوی کا اقتباس دیا جو پاکستانی وفد نے اقوام متحدہ میں پیش کیا۔

سکھ وسیع پیمانے پر فسادات کی آگ بھڑکانے کے لئے جو تیاریاں کر رہے تھے وہ حکومت کو معلوم تھیں۔ بلکہ سکھ لیڈر راز خود رازداری سے کام نہیں لے رہے تھے۔ شواہد اس قدر ناقابلِ تردید تھے کہ وائسرائے مجبور ہو گیا کہ مہاراجہ پٹیالہ، ماسٹر تارا سنگھ اور دیگر سکھ لیڈروں کو انتباہ کرے کہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ وائسرائے نے اوائل جولائی (۱۹۴۷ء) میں کانگرس اور مسلم لیگ لیڈروں اور ارکان عبوری حکومت کا جو اجتماع کیا اس میں فیصلہ کیا گیا کہ سکھ لیڈروں کو جن میں خصوصیت سے ماسٹر تارا سنگھ اور ادم سنگھ ننگو کی قابل ذکر تھے فی الفور گرفتار کر لیا جائے۔ یہ گرفتاریاں عملاً بہ لطائف الحیل ملتوی کی جاتی رہیں اور سکھوں کو موقع مل گیا کہ وہ ۹ راگست کو حکومت پاکستان کے عملہ اور ان کے عیال کو دہلی سے کراچی لے جانے والی اسپیشل گاڑی پر منظم سازش کے تحت حملہ کریں۔

پاکستانی وزیر مالیات کے الزامات کے جواب میں انگلستانی دفترِ روابطِ دولت مشترکہ نے اسی روز یعنی ۵ رجولائی کو اس مضمون کا بیان شائع کرایا کہ لارڈ مونٹ بیٹن کے فیصلوں کو حکومت برطانیہ کی سندِ قبولیت حاصل تھی۔ نیز سکھ لیڈروں کو گرفتار نہ کرنے کا فیصلہ اس نے گورنر پنجاب (اور مشرقی اور مغربی پنجابوں کے ہونے والے گورنروں یعنی سر چاندو لال تریویدی اور سر فرانسس موڈی) کے مشوروں سے کیا۔ جہاں تک تقسیم میں عجلت کا تعلق ہے اس کا نظام الاوقات دونوں مستعمرات کے نمائندوں کی رضامندی سے طے پایا تھا۔ اس نظام الاوقات کو بھی حکومت برطانیہ کی سندِ قبولیت حاصل تھی۔

۷ رجولائی کو یعنی دو دن بعد حکومت پاکستان کی وزارت خارجہ نے کراچی سے جوابی بیان شائع کیا جس میں جناب غلام محمد کے الزامات کی تائید کی گئی اور برطانوی حکومت کے اس استدلال کا کہ لارڈ مونٹ بیٹن کے فیصلوں کو برطانیہ کی تائید حاصل تھی یا اس نے سکھ لیڈروں کی گرفتاری گورنر پنجاب یا کسی اور کے مشورے سے ترک کر دی۔ کامیابی سے تار و پود بکھیر گیا اور اپنی طرف سے عاجلانہ فیصلہ تقسیم کو قبول کر لینے کی یہ صفائی پیش کی۔

ایک عذر لنگ یہ پیش کیا گیا ہے کہ تقسیم کا نظام الاوقات دونوں مستعمرات کے نمائندوں کے

استصواب سے کیا گیا تھا۔ جہاں تک مسلم لیگی لیڈروں کا تعلق ہے ان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ انھوں نے بارہا اس امر پر زور دیا کہ مقررہ وقت پر امن اور مکمل تقسیم کے لئے ناکافی ہے۔ اس مشورہ کو ٹھکراتے ہوئے اور اس کے علی الرغم ۱۵ اگست کی تاریخ لارڈ مونٹ بیٹن کی ضد کی وجہ سے مکمل انتقالِ اقتدار کے لئے مقرر کر دی گئی۔ اس تاریخ کے تعین کے بعد مسلم لیگی زعما شدت سے پیہم مطالبہ کرتے رہے کہ حکومت برطانیہ اس وقت تک اپنی ذمہ داری سے دستکش نہ ہو جب تک کہ انتقالِ اقتدار مکمل نہیں ہو جاتا اور دونوں مستعمرات کی افواج کی از سرِ نو تنظیم و تربیت نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد جو المناک حادثات پیش آئے ان سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ رائے جسے لارڈ مونٹ بیٹن نے غالباً حکومت برطانیہ کے مشورہ سے مسترد کر دیا تھا کس قدر صحیح تھی۔

اگر مقدمہ حکومت برطانیہ اور حکومت پاکستان کے مابین ہوتا تو حکومت پاکستان کا استدلال فی الجملہ برتر اور ناقابلِ رد تھا۔ حکومت برطانیہ لارڈ مونٹ بیٹن کی مدافعت میں بیان دے کر اس کے جرم کو تو کم نہیں کر سکی۔ البتہ اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہے۔ لیکن اس استدلالی مقابلہ سے ہٹ کر دیکھئے تو ایک اصولی سوال سامنے آتا ہے جس کے جواب کا ہم مطالبہ کرتے ہیں۔ جناب غلام محمد، حکومت پاکستان، جناب غضنفر علی خاں کے بیانات اور ڈان کے افتتاحیہ کو پھر سامنے لائیے۔ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ پنجاب میں سکھوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ ایسے مسلمان دشمن گروہوں کی جنگی تیاریاں کہ جن کا نتیجہ مشرقی پنجاب اور دہلی کے قتلِ عام تھے راہنمایانِ مسلم لیگ اور مسلم ارکان عارضی حکومت (ہند) سے مخفی نہیں تھیں۔ محض مخفی ہی نہیں تھیں بلکہ انھیں ان کے تباہ کن نتائج کا بھی احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے لارڈ مونٹ بیٹن کو متعدد مرتبہ مجبور کیا کہ وہ ان خوفناک تیاریوں کا سدِ باب کرے۔ ایک مرتبہ عارضی حکومت سے تجویز بھی منظور کرا لی گئی کہ سکھ لیڈروں کو گرفتار کر لیا جائے، لیکن لارڈ مونٹ بیٹن نے اپنے مصالح کی بنا پر اس پر عمل نہ کیا۔ آج پاکستانی وزراء، حکومت اور اس کا نقیب ان باتوں کا اعادہ کر کے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے قتلِ عام کے ذمہ دار لارڈ مونٹ بیٹن اور حکومت برطانیہ ہے۔ یہ الزام درست

مونٹ بیٹن اس سے بھی زیادہ موردِ الزام، برطانوی حکومت اس سے زیادہ شریک جرائم، لیکن قوم اپنے لیڈروں سے پوچھتی ہے کہ جب آپ کو اتنے وثوق سے اس کا علم ہو چکا تھا کہ اتنا عظیم الشان خطرہ مسلمانوں کے سر پر منڈلا رہا ہے اور آپ کو اس کا بھی علم تھا کہ مونٹ بیٹن مسلمانوں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کرے گا بلکہ شاید وہ اس سازش میں خود شریک ہے، تو آپ نے اپنی قوم کو اس قتل و غارت گری سے بچانے کے لئے کیا اقدامات کئے؟ کیا ان حالات میں آپ کا فریضہ محض اس قدر تھا کہ آپ لارڈ مونٹ بیٹن سے تحفظ امن کا مطالبہ کرتے اور اس کے ٹال دینے پر عافیت کدوں میں آ کر اطمینان اور بے فکری سے داد استراحت دیتے؟ آپ لارڈ مونٹ بیٹن کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے تھے تو کیا آپ سوئے قوم آ کر قوم کو آنے والے خطرہ سے آگاہ نہیں کر سکتے تھے؟ اسے اس کے لئے تیار نہیں کر سکتے تھے؟ یا اسے حالات سے آگاہ کر کے یہ موقع نہیں دے سکتے تھے کہ وہ از خود اپنی حفاظت کے سامان کر لے؟ جب تک قوم کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا وہ اس نتیجہ تک پہنچنے میں بالکل حق بجانب ہے کہ مسلمانوں کے تمام قتل و غارت کا ذمہ دار قومی نقطۂ نگاہ سے نہ مونٹ بیٹن ہے نہ مرکزی حکومت — بلکہ اس بے گناہ دریائے خون کی ساری ذمہ داری، ان راہنمایانِ قوم کے سر ہے جنھوں نے خطرہ کو بھانپا لیکن قوم کو بے خبر رکھا۔ جنھوں نے سیلاب بلا امڈتا دیکھا اور قوم کو آگاہ کرنے کے روادار نہ ہوئے۔

یہ کہہ کر کہ سنگھوں اور سنگھیوں کی تیاریوں سے آپ آگاہ تھے آپ نے کسی راز کا افشا نہیں کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کو ان کا علم تھا۔ اسی اشاعت میں "مسلم لیگ کے سابق کارکن" کے تاثرات شائع ہو رہے ہیں۔ اس کارکن نے مغربی پنجاب کے ایک حصہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہے کہ مقامی طور پر مسلمانوں کو جب بھی خطرے سے آگاہی ہوتی تھی وہ فوراً اسے اپنے لیڈروں تک پہنچا دیتے تھے۔ اُدھر مرکزی کابینہ میں ان امور پر بحث و تمحیص ہوتی تھی۔ گویا ایک طرف ہمارے لیڈروں کا سرچشمہ اطلاع سرکاری ذرائع اور ایوانِ حکومت تھا اور دوسری طرف ذریعۂ معلومات خود قوم تھی۔ قوم کے سامنے صرف وہ خفیف سی جنبش آ جاتی تھی جو سطح آب پر، زیر آب نہنگوں اور اژدروں کی کروٹ بدلنے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ ان بیچاروں کو خطرہ کا کبھی ایسا علم نہ تھا جیسا وائسرائے کی کونسل میں بیٹھنے والے لیڈروں

کو تھا۔ سوال یہ ہے کہ خطرہ سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود لیڈران قوم نے تحفظِ قوم کے لئے کیا کیا؟ انھوں نے قومی مدافعت کی کوئی تجویز نہیں سوچی اور کوئی منصوبہ نہیں باندھا۔ قوم اس جھوٹے اطمینان میں رہی کہ باخبر اربابِ قوم جو عارضی مرکزی حکومت میں حقوقِ مسلم کے پاسبان بن کے موجود ہیں قانونی مدافعت کا مناسب انتظام کردیں گے اور اگر فی الواقعہ کوئی خطرہ آنے والا ہوگا تو اس سے قوم کو آگاہ کردیں گے ان لیڈروں نے اپنی حفاظت کا ضرور انتظام کیا اور بے فکری سے پایہ تخت پاکستان —— کراچی —— میں سریر آرا و مسند نشین ہوگئے۔ اگر مدافعت کا انتظام نہ بھی ہوتا لیکن قوم کو خطرہ سے آگاہ کردیا جاتا تو قوم کبھی اس طرح ذلت کی موت نہ مرتی۔

اپنی معصومیت کا دوسرا عذرِ لنگ یہ پیش کیا جارہا ہے کہ تقسیم عجلت میں منوائی گئی اور لارڈ مونٹ بیٹن نے ضد کرکے ۱۵ اگست کی آخری تاریخ مقرر کردی۔ برطانوی دفترِ روابط دولت مشترکہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ جو کچھ بھی نظام الاوقات طے ہوا اسے دونوں مستعمرات کے نمائندوں نے تسلیم کرلیا تھا۔ اب یہ کہنا کہ ہم نے تو احتجاج بھی کیا تھا اور وائسرائے کو عجلت کے خطرناک عواقب سے متنبہ بھی کیا تھا لیکن ہم بے بس ہوگئے اور مجبوراً راضی ہوگئے تھے کوئی باوزن استدلال نہیں۔ بدیہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عجلت کو اپنی قوم کے لئے تباہ کن خیال کرتے تھے، جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کردکھایا، تو آپ نے محض احتجاج پر کیوں اکتفا کی؟ اگر لارڈ مونٹ بیٹن نے آپ کے مطالبہ کو ٹھکرادیا اور آپ نے یہ دیکھا کہ آپ اسے قائل نہیں کراسکتے لیکن اس کے سامنے سپر ڈالنے سے قوم ہلاکت کے جہنم میں جھونکی جائے گی تو آپ نے قوم سے کیوں استصواب نہیں کیا؟ قوم کو کیوں رازدار نہیں بنایا؟ اسے کیوں نہ بتایا کہ وہ ایک شخص یعنی مونٹ بیٹن کی ضد یا برطانیہ کی حکمتِ عملی پر بھینٹ چڑھ رہی ہے؟ یہ کہنا کہ مسلم لیگ کے پاس ان مخصوص حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ بے بسی پر اس تعجیلی کارروائی پر صاد کرتی، لچر اور بیہودہ ہے، اس لئے کہ جب مسلم لیگ محض ایک سیاسی پارٹی تھی، اور وہ بھی اس قسم کی پارٹی کہ کئی پارٹیوں میں سے ایک پارٹی، تو اس حالت میں وہ ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک کرپس تجاویز سے وزارتی وفد کی تجاویز تک ایک خاص قسم کی سیاسی ضد کا کامیاب مظاہرہ کرتی چلی آرہی تھی۔ سابقہ ہند کا آئینی تعطل بہت

...... حد تک نتیجہ تھا مسلم لیگ کی غیر مصالحانہ روش کا۔ غیر مصالحانہ اس لئے کہ اس نے محض مصالحت کی خاطر اپنے بنیادی مطالبہ کو قربان نہیں کیا۔ جس کا لازمی نتیجہ تعطل تھا۔ ایک عالم مسلم لیگ کو غیر مصالح جوادٔ مفاہمت ناپسند کہہ رہا تھا۔ کانگریس اور برطانیہ کے اتحاد کے برخلاف تنہا مسلم لیگ ڈٹی رہی اور بالآخر وہ ہو کر رہا جس کا مسلم لیگ مطالبہ کر رہی تھی۔ اب مسلم لیگ ہندوستان کی عارضی مرکزی حکومت میں بھی شریک تھی اور تقسیم کا فیصلہ ہو جانے پر وہ ایک نئی مستعمرہ کی آزاد حکومت بن گئی تھی۔ اب وہ زیادہ موثر انداز سے اپنے مطالبات منوا سکتی تھی۔ وہ پھر تعطل پیدا کر سکتی تھی۔ وہ بھی بضد ہو جاتی تو لارڈ مونٹ بیٹن اور حکومت برطانیہ کو بطریق سابق جھکنا پڑتا۔ ان کے پاس اس کے علاوہ یقیناً اور کوئی چارہ نہ رہتا۔ لیکن چونکہ اس نے محض احتجاج تک اکتفا کیا اور کوئی عملی اقدام نہیں کیا اس لئے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عجلت کو اس نے آخر کار دانستہ قبول کر ہی لیا تھا۔ شاید اس نے بھانپ لیا ہو کہ جو خطرہ قوم کو پیش آنے والا ہے وہ قیام پاکستان کے مقابلہ میں زیادہ وقیع نہیں۔ اس نے یہی فیصلہ کیا ہوگا کہ سودا مہنگا نہیں۔ لیکن جب واقعی قیمت ادا کرنی پڑی تو اس وقت آپ کو احساس ہوا کہ سودا مہنگا ہے اور قیمت جنس کے مقابلہ میں زیادہ دینی پڑی ہے۔ چنانچہ اب لعنازمرگ واویلا کیا جا رہا ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تاریخ تقسیم تھی۔ پاکستان کے ایڈر اس تاریخ سے پہلے ہی پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں جمع ہونا شروع ہو گئے تاکہ دھوم دھام سے آزادی کے جشن منائے جائیں۔ ادھر پاکستان میں جشن آزادی منایا جا رہا تھا اور ادھر ہندوستان میں "لیکے رہیں گے پاکستان" کے نعرے لگانے والے مسلمان تہ تیغ کئے جا رہے تھے۔ کراچی میں شجر پاکستان کے پتوں کی آبیاری ہو رہی تھی اور ہندوستان میں پاکستان کی جڑیں مستاصل کی جا رہی تھیں۔ پاکستان میں اس قتل عام نے ضرور ارتعاش پیدا کیا۔ ۲۰ اگست کو غضنفر علی خاں نے لارڈ مونٹ بیٹن کو یاد دلایا کہ اسے سکھوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرنی ہے۔ (اگر کارروائی نہ کی گئی تو ...... تو؟ ...... میں تو بچ کے آ گیا ہوں لیکن مسلمان سب ذبح ہو جائیں گے)۔

اس یاد دہانی کے بعد لیڈران پاکستان خاموش نہیں ہو گئے۔ بلکہ

جز آسماں کی کھو رہے ہیں پڑے پڑے

کے مصداق انھوں نے اقوام متحدہ میں جو کیس بھیجا اس میں بھی اس کا تذکرہ کیا اور آج جناب غلام محمد نے لارڈ مونٹ بیٹن پر آخری تیر بھی چلا دیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ مقام نشانہ سے اٹھ کر جا چکا تھا۔ پورے دس مہینے تک جس راز کو قوم سے چھپا کے رکھا گیا تھا آج اسے لندن کے چوراہے میں افشا کر دیا گیا ہے!

قارئین تھوڑی دیر کے لئے اشاعت مارچ کے مضمون "محاسبۂ نفس" کو سامنے رکھیں۔ جس میں ہم نے ان غلطیوں کا جائزہ لیا تھا جو تقسیم کے وقت ہم سے سرزد ہوئی تھیں۔ ہم نے لکھا تھا کہ پہلی غلطی یہ تھی کہ ہم نے تعجیلی کارروائی پر صاد کیا، دوسری غلطی یہ تھی کہ بلا تعیین حدود پاکستان کو قبول کر لیا اور تیسری غلطی یہ کہ افواج و عساکر و آلات و سامان حرب کی تقسیم کے بغیر جداگانہ سلطنت قائم کر لی۔ ان اصولی اسقام و نقائص کا ذکر ہم نے اس لئے کیا تھا کہ قوم اپنے اعمال کا جائزہ لے اور تنقید کی محک پر پرکھے تاکہ اسے معلوم ہو کہ کہاں غلطی سرزد ہوئی ہے۔ نیز وہ ان غلطیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرے اور ان کی روشنی میں آئندہ صحیح اقدام کرے۔ لیکن ملت اسلامیہ پاکستانیہ ابھی اس معیار تک نہیں پہنچی کہ ہمارے زعماء اپنی غلطیوں کا کشادہ دلی سے اعتراف کریں اور ان سے استفادہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ غلام محمد صاحب نے دس ماہ تک اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ قوم کو مخاطب کر کے بالمشافہ گفتگو کریں اور اپنی غلطیوں کا باہمی تذکرہ کریں اور آئندہ کے لئے احتیاط برتیں۔ اس کے برعکس لندن میں جا کر اپنے جامے کے دھبے ٹیمز میں دھونے کی کوشش کی۔ آپ نے تو مونٹ بیٹن کا دامن حریفانہ کھینچا ہے اور اسے مورد الزام قرار دیا ہے، اور قوم آپ کا دامن کھینچتی ہے اور لاکھوں مظلومین کے بیگناہ خون کی دہائی دیتی ہے اور یہ پوچھتی ہے "بای ذنب قتلتنی؟" ذبح ہونے والی مائیں، بے آبرو ہونے والی بہنیں، نیزوں کی انیوں سے چھدنے اور پتھروں پر پاش پاش ہو جانے والے بچے، کرپانوں سے شہید ہونے والے نہالان امت، جو موت کی مہیب و پر سکوت وادی میں جھونک دیئے گئے ہیں، ان کی معصومیت، مظلومیت کپکپی پیدا کرنے والی اور نہ تھمنے والی چیخ کی صورت میں ہمارا

تعاقب کر رہی ہے۔ تاریخ کا مکبّر الصوت اس چیخ کو "صورِ قیامت" میں بدل دے گا۔ اور یہ "مردے" زندہ ہو کر پوچھیں گے:

قصاصِ خونِ تمنا کا مانگئے کس سے؟ گنہگار ہے کون اور خوں بہا کیا ہے؟

قوم حق بجانب ہے کہ لیڈروں کے اعتراف کے پیشِ نظر ان سے کہے کہ

بچے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

آزاد پاکستان میں رمضان

قیام پاکستان کے بعد مولوی صاحبان نے بڑے شدومد سے مطالبہ شروع کر دیا کہ نظام حکومت شرعی ہونا چاہیے۔ اس مطالبہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے متعلق ہم نے ایک سے زیادہ مرتبہ لکھا ہے کہ ان مطالبات کا بالعموم خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان بھر میں اتوار کی بجائے جمعہ کو تعطیل ہوا کرے، شراب خانوں اور قحبہ خانوں کی بندش کا اعلان کر دیا جائے۔ نکاح، وراثت قسم کے معاملات مفتیوں کے ہاں سے فیصل ہوا کریں یا اس سے ذرا آگے بڑھے تو ارباب حکومت ڈاڑھیاں بڑھالیں، لبیں ترشوالیں، نمازیں پڑھنا شروع کر دیں اور اسلامی تہواروں پر جشن کا انتظام کر دیا کریں تو مولوی صاحبان کا مطالبہ پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ارباب حکومت نے ہماری عرضداشت پر کماحقہ غور نہیں کیا اور یہ یقین کرنے پر تیار نہیں ہوئے کہ مولوی صاحبان کا مطالبہ کس طرح بآسانی پورا کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس مطالبہ کے جواب میں حکومت خاموش رہی اور بعض ارباب حکومت ــــ انفرادی حیثیت سے ــــ لفظی وعدے کرتے رہے ــــ یا ہو سکتا ہے کہ ارباب اختیار اس تصور سے ڈر رہے ہوں کہ ایسا نظام رائج ہو گیا تو انہیں کم از کم نماز ضرور پڑھنی پڑے گی، وانہ لکبیرۃ الا علی الخاشعین۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض حلقوں میں خوف و دہشت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ہم حیران تھے کہ کوئی ایک بھی رجل رشید نہیں جو اس مطالبہ کی لم سمجھے اور نہایت آسانی سے ان کا ممدوح و محترم بن جائے۔ ہینگ لگے، نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔

بعد از خرابی بسیار ہی سہی لیکن ایک رجل رشید پاکستان کو میسر آہی گیا جس نے ان بالائے سطح موجوں کا جائزہ لیا اور ان سے الجھ گیا۔ اتفاق سے ماہ رمضان بھی آگیا۔ چنانچہ حکومت پاکستان کی طرف سے یہ سرکاری بیان شائع ہوا۔

رویتِ ہلال اور آغاز رمضان کی صحیح تاریخ سے متعلق غلطی کا امکان دور کرنے کے لئے حکومت پاکستان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مندرجہ ذیل علما اور ارباب مذہب ۲۹ شعبان (مطابق ۷ جولائی) کی شام کو جو فیصلہ صادر کریں گے اسے حکومت نشر کرے گی۔ (علمار کے نام محذوف ہیں)۔

علما اور دیگر اصحاب مذہب کراچی صدر بازار کی میمن مسجد میں ساڑھے سات بجے شام کو جمع ہوں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا چاند ہوا یا نہیں۔ اس فیصلہ کو فی الفور اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ نشر کر دیا جائے گا۔ (ڈان ۶/۷/۴۸)

۷ رجولائی کے ڈان میں وزارت داخلہ کا ایک اور بیان شائع ہوا جس میں علمار کی کمیٹی میں تبدیلیاں کی گئیں اور یہ کہا گیا:۔

جو مسلمان رمضان کا چاند دیکھیں وہ مجلس علمار کے سامنے آکر اپنی شہادت دیں۔

یہ سرکاری بیان خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر داخلہ و نشریات کے شعبہ سے متعلق ہے۔ ہم خواجہ صاحب سے اتنا پوچھنے کی جسارت کرتے ہیں کہ چاند دیکھنے یا اس کے نمودار ہونے سے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے علمار کے پاس کونسی امتیازی امدادی شے تھی جو خود خواجہ صاحب، ان کے رفقائے کار یا دیگر حضرات کے پاس مفقود تھی کہ جس سے چاند دیکھنے میں آسانی ہو، یا یہ گواہی لینے میں کہ کہیں چاند نظر آگیا۔ یہ معاملہ اگر کسی ناظم رصدگاہ کے سپرد کیا جاتا تو بات قابل فہم بھی ہوتی کہ رصدگاہ میں ایسے آلات موجود ہیں جو چاند دیکھنے میں انسانی آنکھ کے مقابلے میں کہیں دوررس ہیں۔ اس مقصد کے لئے علمار کے گروہ کا انتخاب و اختصاص ناقابل فہم ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ تخصیص اس نظریہ کی آئینہ دار ہے کہ امور مذہب تو علما سے متعلق ہیں لہٰذا انہیں ہی ان کے متعلق فیصلے دینے چاہئیں اور امور دنیا ارباب حکومت کا فریضہ ہیں جس میں علمار کو دخل نہیں۔ چاند کی رویت کا فیصلہ یا تو خود دیکھنے سے ہو سکتا ہے یا ان اصحاب کی شہادت سے جنھوں نے چاند کو دیکھا ہو۔ پہلی صورت میں علمار کی تخصیص بے کار ہے کیونکہ ہر صاحب نظر چاند دیکھ سکتا ہے اور اس باب میں کسی عالم کو کسی عامی پر از روئے علم مذہب کوئی فوقیت نہیں۔ جہاں تک شہادتوں کا تعلق ہے اس کے لئے حکومت کے پاس اپنا نظام، عدالتی نظام۔ موجود ہے۔ وہ نظام ایسا ..... ہے کہ جھوٹے سے

بڑے عالم کو بھی اپنے بیان کی تصدیق میں مجسٹریٹ کے سارٹیفکٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا اس نظام میں بھی علما کو کوئی اختصاص و برتری حاصل نہیں۔ سو اگر حکومت کا یہ نظام شہادت دیگر امور میں معتبر ہو سکتا ہے تو چاند کے معاملہ میں اسے کیوں غیر معتبر سمجھا جائے؟ کیا کوئی مجسٹریٹ شہادتیں لے کر ایک عالم کے مقابلہ میں اپنے تجربہ کی بنا پر بہتر فیصلہ نہیں دے سکتا؟ لیکن رویت ہلال کا معاملہ اس نظام کے سپرد اس لئے نہیں کیا گیا کہ یہ نظام تو امور دنیا سے متعلق ہے اور رویت ہلال خالصۃً مذہبی معاملہ ہے جسے علمائے مذہب ہی نپٹا سکتے ہیں۔

ایک طرف چودہری خلیق الزماں ایسے متوحش حضرات تھے جو کہہ رہے تھے کہ شریعت کا نفاذ کرنا ہے تو پہلے مولویوں کو گاؤں گاؤں بھیجو تاکہ وہ عوام کے اخلاق درست کریں اور انھیں شریعت کے قانون کے لئے تیار کریں۔ لیکن دوسری طرف ہمارے زعمائے کرام میں خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر داخلہ جیسے حضرات بھی ہیں جنھوں نے یہ اعلان فرمایا ہے کہ

> اگر سیاست ایک بلند اور پھیلنے والا درخت ہے تو مذہب اس کی زرخیز زمین ہے۔ سیاست عمارت ہے لیکن مذہب یقینی طور پر بمنزلہ چونا اور اینٹ ہے۔ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کو اس مادیت کی غلطی سے بچنا چاہئے جس نے مغرب کو بہم المناک حادثات سے دوچار کرایا ہے۔ (ڈان ۲۹ جون)

ہم خواجہ صاحب کے اس بیان سے خوش تھے کہ دیدہ ام مردے ودیں قحط الرجال۔ لیکن ہماری خوشی عارضی اور ناپائیدار ثابت ہوئی کیونکہ یہ کچھ کہنے والا عملاً اپنی تغلیط کر رہا ہے۔ اس کی نگاہوں سے یہ امر اوجھل ہے کہ اس کا فعل اس کے قول کے منافی ہے۔ وہ مذہب اور سیاست کو لازم و ملزوم کہہ کر اور ایک دوسرے کو لاینفک قرار دیتے ہوئے بھی مذہبی اور دنیاوی امور میں فرق کر رہا ہے اور دونوں معاملات علیحدہ علیحدہ ارباب مذہب ..... اور ارباب دنیا کے سپرد کر رہا ہے۔

زیر نظر معاملہ یعنی رویت ہلال رصد گاہ اور نشر و اشاعت سے متعلق تھا۔ یا اسی قسم کے دوسرے ذرائع سے فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ حکومت ان ذرائع کو استعمال کر کے جو فیصلہ بھی دیتی وہ شریعت کا فیصلہ ہوتا۔ اس فیصلہ کو شرعی بنانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اسے کسی عالم دین کی کٹھالی میں ڈال کر نکالا جائے۔

مسلمانوں کی حکومت کے فیصلے جو شرعی حدود ـــــ حدود اللہ ـ سے متصادم نہ ہوں، شرعی ہوتے ہیں۔ عام اس سے کہ ان پر کسی عالم مذہب کی "جواب صحیح" مہر لگی ہو یا نہ۔ جب تک شریعت کا صحیح مفہوم ہمارے ذہنوں میں نہیں اتر جاتا اس وقت تک یہ الجھاؤ ناگزیر رہے گا اور محترم خواجہ صاحب کے اعلان کے باوجود مذہب اور سیاست عملاً جدا جدا رہیں گے۔

ہاں تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ علما کا مطالبہ قیام نظام شریعت کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ دیکھئے یہ مطالبہ کس قدر آسانی سے پورا ہو گیا اور سودا بھی کتنا سستا رہا۔ اس ضمن میں علماء کی محولہ بالا "کانفرنس" کے علاوہ جو کچھ حکومت کی طرف سے اقدامات ہوئے ان کی کیفیت یہ ہے۔ ۲۰ جولائی کو وزیراعظم سندھ پیر الٰہی بخش صاحب کا بیان بایں مضمون اخبارات میں شائع ہوا۔

مجھے متفرق انجمنوں کی طرف سے متعدد عرضداشتیں موصول ہو رہی ہیں جن میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ حکومت رمضان میں دن کے وقت ہوٹلوں کو حکماً بند رکھے، شکر کی مقدار زیادہ کر دے اور افطار و سحری کے وقت توپیں چلائے۔

ہم مسلمانوں پر قرآن نے رمضان کے روزوں اور پنجگانہ نماز کے فریضے عائد کئے ہیں۔ لہذا میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ از خود دن کو ہوٹل بند رکھیں۔ ساتھ ہی میں عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ایسی رائے عامہ تیار کریں کہ ہر مسلمان صادق اور مومن بن جائے . . . کوئی دنیاوی حکومت اس سے زیادہ مؤثر (Force) احکام صادر نہیں کر سکتی۔

میں مسلمانوں سے یہ بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ کسی غیر مسلم (ہوٹل والے) کو تنگ نہ کریں۔ اگر وہ از خود ہوٹل بند رکھیں تو ان کی نوازش ہے۔

جہاں تک شکر کی مقدار میں اضافہ کا تعلق ہے حکومت ضرور مناسب کارروائی کرے گی۔

توپیں چلانے کی ضرورت نہیں کیونکہ میونسپل سائرن دونوں وقت بجا کریں گے اور شہر بھر میں سنائی دیں گے۔ (کراچی کا سائرن تو بجتا نہیں، روتا ہے۔ طلوعِ اسلام)

مجھے توقع ہے کہ تمام انجمنیں اور اس معاملہ میں دلچسپی لینے والے حضرات ان اقدامات سے

مطمئن ہو جائیں گے۔ (ملخص از ڈان ۲۹ جون ۲)

وزیر اعظم سندھ کی "دینداوی حکومت" نے نہ محض یہ forcement کے احکام صادر کئے بلکہ ازراہِ غایت کرم گستری مسجدوں کی کمی کی وجہ سے پبلک پارکوں میں نماز تراویح کی اجازت بھی دیدی اور سرکاری طور پر چٹائیوں، لوٹوں، پانی، روشنی اور مولویوں کا بندوبست کردیا۔ حفاظ سے درخواست کی گئی کہ اپنی درخواستوں سمیت حکیم محمد احسن صاحب سابق میئر کراچی کی خدمت میں پیش ہوں۔ اور عام مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ جوق در جوق تراویح کی نماز میں شریک ہوں۔ (ڈان ۲۹ جون ۸) ان انتظامات پر حکومت کی طرف سے کوئی پانچ ہزار کی خطیر رقم خرچ ہوگی۔ (ڈان ۲۹ جون ۱۰)

صوبائی حکومت کے دوش بدوش مرکزی حکومت بھی مصروفِ عمل تھی۔ مجلس علماء کے قیام کے بعد جناب لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے مندرجہ ذیل بیان اخبارات میں شائع کرایا۔

حکومت پاکستان کی خواہش ہے کہ پاکستان بھر کے مسلمان رمضان لفظاً و معناً منائیں۔ اسلام کے احکام کے مطابق تمام صحت مند مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقدس مہینہ میں روزے رکھیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو اصحاب قوانین شریعت کی رو سے کسی بیماری کی وجہ سے معذور ہوں وہ رمضان کا احترام کریں اور دن میں اعلانیہ کھانے، پینے اور تمباکو نوشی سے پرہیز کریں۔ حکومت متوقع ہے کہ تمام مسلمان بالعموم اور ملازمین حکومت بالخصوص اپنے عمل سے ثابت کر دکھائیں گے کہ اسلامی اصول ان کے نزدیک کس قدر عزیز و واجب الاحترام ہیں۔ (ڈان ۲۹ جون ۴)

مرکز نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ سرکاری دفاتر کے اوقات صبح آٹھ بجے سے دوپہر کے ڈھائی بجے تک کر دیئے گئے (جمعہ کو آٹھ سے ساڑھے بارہ بجے تک[1]) صوبائی حکومت نے سرکاری آب رسانی کے اوقات میں بھی تبدیلی

---

[1] واضح رہے کہ سرکاری دفاتر ... معمولاً جمعہ کو ساڑھے بارہ بجے بند ہو جاتے ہیں۔ ایک cynic نے اس پر دلچسپ تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب جمعہ کی نماز نہ پڑھنے والے اطمینان سے گھروں میں بیٹھ سکیں گے اور اوروں کی انگشت نمائیوں سے محفوظ رہیں گے۔ انہی صاحب کا اب خیال ہے کہ دفتر کے اوقات بدل کر حکومت نے "معذوروں" کے لئے یہ آسانی پیدا کر دی ہے کہ وہ اعلانیہ کھانے پینے پر مجبور نہ ہوں اور دوپہر کو گھر جا کر بلا خوف لومۃ لائم معذوروں کا "احترام" کر سکیں۔

کر کے سحری اور افطار کے مطابق کر دیئے۔

صوم کے ساتھ صلوٰۃ بھی مسلمانوں پر ویسی ہی فرض ہے۔ لیکن ہمارے وزیر اعظم جو آج روزوں کے احترام کی تلقین کر رہے ہیں ان کی بارگاہ عالیہ میں گذشتہ چھ ماہ سے عرض کیا جا رہا ہے کہ آپ کے سکریٹریٹ میں ملازمین کے لئے نماز پڑھنے کا کوئی بندوبست نہیں کیونکہ ان کے لئے کوئی مسجد نہیں۔ آنجناب نے نہ اس ضمن میں کوئی اعلان فرمایا نہ تعمیر مسجد کے لئے جنبش کی۔ آج جناب شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی بارگاہ سے بھی وزیر اعظم کو ان اسلامی اقدامات پر مبارکباد دی جا رہی ہے، حالانکہ یہی شیخ الاسلام ہم عامیوں کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایک روزہ نہ رکھنے کے عوض میں اور روزے رکھ کے بھی چھٹکارا ہو سکتا ہے لیکن ترکِ صلوٰۃ کی سزا شریعت میں موت ہے۔

۸ جولائی کو کراچی میں تقریر کرتے ہوئے علامہ عثمانی نے فرمایا۔

سندھ کے وزیر اعظم پیر الٰہی بخش نے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ کراچی میں رمضان المبارک میں یہ معلوم ہو کہ پاکستان صحیح معنوں میں اسلامی ملک ہے۔ آپ نے کہا کہ چودہری خلیق الزماں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ شریعت کے قانون کے نافذ کرنے کے لئے پہلے فضا کا سازگار ہونا ضروری ہے خدا کا شکر ہے کہ اب فضا سازگار ہو رہی ہے۔ انشاءاللہ اسلام کی شان کراچی میں ظاہر ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ سینما بھی رمضان میں بند ہونے چاہئیں۔ جب شراب کی دکانیں بند ہونگی تو سینما ایسے اوقات میں بند ہونے بہت ضروری ہیں جب تراویح وغیرہ ہوتی ہے . . . . خدا کا شکر ہے کہ ہمارے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے رمضان المبارک کے سلسلہ میں ایک پرزور اپیل شائع کی ہے . . . . آج ہم ۲۹ یا ۳۰ دن کے لئے اہتمام کر رہے ہیں۔ لیکن جلد ہی وہ دن آئیگا جب ہمیشہ کے لئے یہی چیز پیدا ہو جائے گی۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہماری کل کی تجویز کا ایک جزو ہے۔ (انجام ۸ جولائی)

حکومت نے لیٹوں، چپاتیوں کا بندوبست کر دیا تو علماء کی طرف سے داد و تحسین مل رہی ہے۔ اب علماء کے یہ مطالبات باقی رہ گئے ہیں کہ ٹرامیں رات کے بارہ بجے تک چلا کریں، تراویح کی نماز کے وقت سینما بند رہیں (جیسے پیر الٰہی بخش صاحب نے جمعہ کے دن شراب کی فروخت پر پابندی لگا دی ہے)

گویا سینما صرف نمازِ تراویح میں خلل انداز ہوتے ہیں، معمولی مغرب یا عشا کی نمازوں میں خلل نہیں ڈالتے۔ حکومت اتنا کچھ کردے تو یہ طبقہ مطمئن ہو جائے گا کہ شریعت کا نظام نافذ ہو گیا۔

نفاذ و ترویج نظام شریعت کا یہ تجربہ بظاہر کامیاب معلوم ہوتا ہے کیونکہ حکومت بھی سرخرو ہے اور علماء بھی مطمئن ہیں۔ رمضان کے بعد عید آئے گی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حکومت عید کے تہوار پر علماء کو خلعت شاہانہ عطا کردے اور ساتھ ہاتھوں ایک محکمہ امورِ شرعیہ کا قائم کردے تاکہ حکومت کا خزانہ الگ ہو، جو دنیاوی امور پر صرف ہو اور مذہب کا بیت المال الگ ہو جو امورِ مذہبی پر صرف ہو۔ وہ حکومت کے تصرف میں ہو اور یہ علماء کی تحویل میں۔ انکم ٹیکس اُدھر جمع ہو اور زکوٰۃ ادھر۔ سکول اس سے چلا کریں، مکتب اس سے۔ دنیا بھی بھلی، عاقبت بھی بھلی۔ اس کے باوجود اگر چند سرپھرے نظامِ اسلام و قرآن کا مطالبہ جاری رکھیں تو انہیں خارجی قرار دے کر جہنم رسید کردیجئے۔

یہ تو ہوا نظری حیثیت سے رمضان المبارک سے متعلق اہتمام۔ لیکن عملاً کیا ہوا۔ یہ بھی سُن لیجئے۔

رؤیت ہلال کے لئے علماء کی مجلس قائم کرتے وقت حکومت نے توجیہہ یہ پیش کی تھی کہ رویت کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی پاکستان میں پیدا نہ ہو، لیکن عملاً کیا ہوا؟ جس شام مجلس کراچی میں منعقد ہوئی اس شام کراچی میں چاند نہیں دیکھا گیا۔ ریڈیو پاکستان پشاور نے اطلاع دی کہ وہاں چاند نظر آگیا ہے۔ پاکستان کے اہم مقام پشاور سے پاکستان کا اپنا ریڈیو چاند ہو جانے کی اطلاع دے رہا ہے اور علماء کی سرکاری مجلس گنگ ہے۔ اس مجلس کا کوئی سرکاری بیان حکومت کی طرف سے شائع نہیں ہوا۔ چنانچہ پشاور والوں نے چاند دیکھ کر روزہ رکھ لیا اور کراچی والوں کو ایک دن کی چھٹی مل گئی۔ اس مجلس نے اتنا اعلان بھی نہ کیا کہ ہماری تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ رات چاند نہیں ہوا اور حکومت پاکستان اپنی حدود میں اتنا بندوبست بھی نہیں کرسکی کہ ایک ہی دن روزہ شروع کیا جاتا۔ یہ تو خیر کراچی اور پشاور کا فرق ہے جن میں کم و بیش ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ خود کراچی کا حال دیکھئے۔ یہاں مرکزیت کا یہ عالم ہے کہ اس وقت ہمارے پیش نظر سحر و افطار کے تین نظام الاوقات ہیں۔ ایک پاکستان کے نیم سرکاری اخبار میں چھپا ہے۔ دوسرا پاکستان کے نیم سرکاری مذہبی مرکز مسجد جیکب لائنز کی طرف سے شائع شدہ اور تیسرا ایک اور مقامی انجمن کا ترتیب دادہ۔ ان میں

سحری کا وقت علی الترتیب ۴:۴۰، ۴:۵۰، ۴:۵۵ ہے۔ آئیے، آگے بڑھئے اور ہماری اجتماعیت کا ایک اور نظارہ دیکھئے۔ وہ دیکھئے۔ پارک میں نماز تراویح ہو رہی ہے۔ نماز تراویح نہیں، **نمازہائے تراویح**۔ ایک ہی پارک میں کم از کم تین حفاظ علیحدہ علیحدہ نماز پڑھا رہے ہیں۔ دیکھئے اور ماتم کیجئے اس اسلامی فضا کا، جس پر خوشی کے شادیانے بجائے جا رہے ہیں اور تہنیت کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ شیخ الاسلام کے الفاظ میں یہ ایک مہینہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے! کس قدر کامیاب تجربہ!!

کراچی میں رمضان کا پہلا دن کیسے گذرا؟ یہ کہانی اسلامی حکومت پاکستان کے نقیب ان کی زبانی سنئے۔

> "کراچی نے جمعہ کو رمضان صحیح اسلامی شان سے منایا۔ طعام گاہیں، راشوران، یہاں تک کہ کونوں کی معمولی چائے کی دکانیں تک بند تھیں۔ . . . . . شہر بھر میں سگریٹ اور پان کی ایک دکان بھی کھلی نہیں تھی۔ . . . . . حکومت سندھ کے ایک کلرک کو پاسنگ شو کی ڈبیہ حاصل کرنے کی ناکام کوشش سے تھک کر آخر کہنا پڑا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں روزہ رکھ لیتا۔ مجھے سگریٹ تک نہیں مل سکے۔" (ڈان ۱۰ جولائی ۴۸)

ہم نے بھی شہر کی سیر کی۔ لیکن ہم صحافی کی آنکھ سے محروم تھے۔ ہم نے کئی ہوٹل کھلے دیکھے، چائے کی دکانیں کھلی دیکھیں، لوگوں کو سگریٹ پیتے بھی دیکھا اور پان کھاتے بھی۔ ہم اس پر حیران نہیں کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں چند ایسی دکانیں کھلی ملیں۔ ہمیں تعجب ہے اس نگاہ پر جو دیکھتی کچھ اور کچھ نہ دیکھ سکی۔

یہ ہے اسلامی فضا کا پرتو جس کا ڈھنڈورہ پیٹا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاتھ ان فریب کے پردوں کو چاک کرتے لرزتے ہیں اور دل خون کے آنسو روتا ہے کہ ان کے پیچھے اپنی ہی ملت عریاں ہے۔ لیکن کیا کریں تلبیس حق و باطل کا فن کہاں سے سیکھیں!

اس اسلامی فضا میں قائم ہونے والے محکمہ امور شرعیہ سے کس قسم کے احکام نافذ ہوں گے۔ لگتے ہاتھ ان کا نمونہ بھی دیکھ لیجئے۔ نئی دہلی میں مکر سٹریٹ کی مرکزی مسجد تھی جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ملازمین حکومت نماز ادا کیا کرتے تھے۔ وہ مرکز کراچی میں جیکب لائنز میں قائم ہو گیا ہے۔ اس مسجد کے امام صاحب نے اوقات کے ساتھ مسائل صوم بھی دیئے ہیں۔ ان کا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

روزہ کا کفارہ ایک غلام آزاد کرنا ہے۔ اگر غلام نہ ہو یا نہ خرید سکے[1] تو متواتر ۶۰ روزے رکھنا . . . . . . کان یا ناک میں پتلی دوا ڈالنا، انیما لینا یا کسی اور ذریعہ اجابت کے مقام سے دوا پیٹ میں پہنچانا، سگریٹ استعمال کرنا حتی کہ دھونی لینا بھی (مفسدات صوم ہیں) . . . .

. . . انجکشن لگوانا نہ مفسد صوم ہے نہ مکروہ (حالانکہ کان میں دوائی ڈالنا مفسد صوم ہے!)

جس کو نفس پر قدرت ہو اس کے لئے بیوی کے پاس اٹھنے بیٹھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ جس کو انزال وغیرہ کا خوف ہو اس کو اجازت نہیں۔[2] . . . .

روزہ کیوں رکھا جاتا ہے؟ اس سے بحث نہیں! روزہ کیسے رکھا جاتا ہے؟ اس سے سروکار ہے! اور وہ بھی صرف اس حد تک کہ ما وجدنا علیہ اٰباءنا . . . . ولو کان اٰباؤھم لا یعقلون . . . . شیئاً ولا یھتدون! . . . . ان چیزوں پر دین کے نقطۂ نگاہ سے تبصرہ بے کار ہے۔ یہ فضا اس انداز تبصرہ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ما انزل اللہ بھا بسلطٰن اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نہیں اتاری۔ عقل سلیم کی رو سے جو تبصرہ ہو سکتا ہے وہ قارئین اپنی اپنی استعداد کے مطابق کر لیں۔

یہ ہیں پاکستان میں پہلے رمضان المبارک کی کیفیات۔ اور ایک پہلا رمضان المبارک، ہجرت کے بعد آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بھی آیا تھا کہ جس کے سترہ دن گذرنے کے بعد، تمام ملت کی متاع نفوس واحوال، بدر کے فیصلہ کن میدان میں، باطل کی پرجوش قوتوں کے سامنے آگئی تھی۔ اُس رمضان کا نتیجہ ــ ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری۔ سب کچھ۔ اور ہمارے رمضان کا نتیجہ سحر و افطار کے وہ گوسلے جن میں صرف آواز ہے، قلعہ شکنی کی صلاحیت نہیں۔

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست   یہ مذہب مُلّا و نباتات و جمادات

---

[1] خرید کیوں نہ سکے؟ مکہ کی گلیوں میں آج بھی انسان بکتے ہیں۔ وہاں سے درآمد کئے جا سکتے ہیں! اور اب تو خیر سے پاکستان کی اسلامی حکومت بھی قائم ہو چکی ہے جہاں بردہ فروشی کو پھر سے رائج کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو کم بخت کفار کی حکومتیں ہیں جو ان چیزوں کی اجازت نہیں دیتیں۔

[2] ایک اسلامی روزنامہ میں جس نے ماہ رمضان المبارک کے احترام میں اپنا حجم چھ صفحات سے چار صفحے کر دیا ہے روزانہ کو "روحانی جلاب" مستعاد کیا ہے اور اسی قسم کے غیرمسنون مسائل و فضائل دیئے ہیں جن کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔